شہرزاد مغرب میں

فاطمہ مرنیسی

ترجمہ: زاہدہ حنا

مشعل بکس

آر۔بی۔۵' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس' عثمان بلاک' نیوگارڈن ٹاؤن'

لاہور۔54600' پاکستان

عزیز دوست اور نکتہ داں مصور

لالہ رخ

کے نام

ترتیب

پیش لفظ

الف لیلہ ولیلہ کی باکمال اور صاحب جمال داستان گو شہرزاد کے بارے میں فاطمہ مرنیسی کی پُر خیال تحریر کا نشہ ابھی ذہن سے نہیں اترا تھا اور اسے اردو میں منتقل کرنے کی مسرت کم نہیں ہوئی تھی کہ قاہرہ سے آنے والی ایک خبر نے دہشت زدہ کر دیا۔ خبر کچھ یوں تھی کہ مصر کے انتہا پسند وکیلوں کی تنظیم کے رکن ایمان عبدالکریم نے مسلم امہ کی تمام اخلاقی بیماریوں کے لیے یہ نسخۂ شفا تجویز کیا ہے کہ مصر کے سرکاری اشاعت گھر سے شائع ہونے والی ''الف لیلہ ولیلہ'' کی نئی اشاعت پر پابندی لگا دی جائے اور اس کے مخربِ اخلاق اور فحش حصوں پر قینچی چلا دی جائے۔

وہ شہرزاد جو اپنی ذہانت' طباعی' نکتہ سنجی اور داستان سرائی کے لیے ہزار برس سے مشرق و مغرب میں شہرت رکھتی ہے۔ وہ شہرزاد جو فلسفے' منطق' تاریخ' جغرافیہ' علم الکلام' علم الہیت اور علم الہندسہ میں طاق تھی' حاضر جوابی اور فی البدیہہ شعر گوئی کے ہنر سے آشنا تھی۔ اپنی بے مثال خرد پروری' جادو بیانی اور شیریں سخنی کے ہنر کے سبب ساسانیوں کے منتقم المزاج اور ذہنی مریض بادشاہ شہریار کی خوں آشام شمشیر سے خود محفوظ رہی اور اپنے ملک میں بادشاہ کے ظلم کے خلاف پھوٹ پڑنے والی بغاوت سے بادشاہ اور اس کی رعایا دونوں کو محفوظ رکھا' اسی شہرزاد پر ہزار برس گزر جانے کے بعد یہ پیمبری وقت پڑا ہے کہ مصر کے انتہا پسند قانون داں' دوڑو۔ پکڑو۔ جانے نہ پائے' کے نعرے لگاتے' دشنام کے تیر چلاتے اور فتووٴں کی تلوار لہراتے ہوئے اس کے تعاقب میں ہیں۔

یقین نہ آیا کہ ہزار برس بعد عرب دنیا کی خرد مند‘
خوش اندام اور دل آرام ہیروئن کے ساتھ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں یہ ہونے والا ہے۔
دل تھام کر خبر کی آخری سطروں تک پہنچی تو معلوم ہوا کہ سرکاری وکیل ادب دوست اور صاحب
ِذوق تھا۔ اس نے مقدمے کو سنے بغیر خارج کر دیا اور کہا کہ ''الف لیلہ ولیلہ'' کے بارے میں
1985ء میں بھی ایسا ہی ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا اور اسے بھی خارج کرتے ہوئے اس عرب
کلاسیک کی اشاعت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یہ داستان ہزار برس سے ساری دنیا سے داد
وصول کر رہی ہے۔ اس پر نہ ہم قینچی چلا سکتے ہیں اور نہ اس کی اشاعت پر پابندی لگائی جاسکتی
ہے۔ یہ داستان عرب دنیا کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ 'الف لیلہ ولیلہ' اپنے وجود میں آنے کے فوراً بعد سے ہی مذہبی
حلقوں میں زیرِ عتاب رہی۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اسلام کے ابتدائی دنوں سے شاعری
اور قصہ گوئی ناپسندیدہ تھی۔ اس کی شدت کا اندازہ ابن اسحاق کی سیرت النبیؐ میں درج اس
واقعے سے کیا جاسکتا ہے جب دورِ رسالتؐ میں نادابن حارث نامی قصہ گو کی گردن اڑا دی گئی
تھی۔ خلافت راشدہ کے دور میں بھی قصہ گو راندۂ درگاہ رہے۔ یہ قصہ گو بازاروں اور مسجدوں میں
پرانے قصوں اور حال کی خبروں کو آمیز کر کے داستان کے رنگ میں سناتے اور ان کے گرد
لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے۔ یہ داستانیں حقیقت اور فسانے کی سرحدوں کو دھندلا دیتیں۔ ایک
ایسے زمانے میں جب حالات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا یہ داستان گو خبر پہنچانے کا واحد
وسیلہ تھے۔ چوتھے خلیفہ کے حکم پر بصرہ کی مسجدوں سے قصہ خوانوں کو نکال دیا گیا اور صرف بصرہ
پر ہی کیا موقوف تھا وہ ہر شہر اور نگر سے نکال دیے گئے۔ محمد بن جریر طبری نے اپنی مشہور کتاب
''تاریخ الامم والملوک'' میں لکھا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں (279ھ) سلطان کے حکم
سے قصہ خوانوں کو بغداد کی جامع مسجد اور گلیوں اور بازاروں سے نکال دیا گیا اور ان کے بارے
میں یہ کہا گیا کہ ''یہ خطرناک لوگ ہیں اور محل کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انہیں خاموش

کر دیا جائے۔''

فاطمہ مرنیسی جس کی مادری زبان عربی ہے اور جو سچ جاننے کے لیے ہماری طرح ناقص اورتحریف شدہ یا سنسر کی زد میں آنے والے تراجم پر انحصار نہیں کرتی اس نے لکھا ہے کہ'' قرون وسطیٰ کے بغداد میں سڑکوں پر پھرنے والے قصہ خواں یا داستان گو عموماً بغاوت کے محرک کہے جاتے تھے اور آج بائیں بازو کے صحافیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اسی طرح ان قصہ خوانوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا تھا۔ ان پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں اور عام مقامات پر ان کا بولنا ممکن نہیں تھا۔ پھر وہ شدادی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہے کہ'' مشرق میں قصہ خوانوں کو اس حد تک آزار پہنچایا گیا کہ آخر کار وہ نیست و نابود ہو گئے اور ان کی جگہ ذاکرین اور واعظین نے لے لی۔''

ادب کا ذوق رکھنے والے سب ہی لوگ جنوں' پریوں اور انسانوں کی کہانیوں کے اس خزانے کے بنیادی خاکے سے آشنا ہیں۔ یہ ایک ساسانی بادشاہ شہریار کا قصہ ہے جو اپنی ملکہ کی بے وفائی کا انتقام اپنی سلطنت کی تمام کنواریوں سے لینے پر تل جاتا ہے۔ وہ اس بے وفائی کی وجوہ پر غور نہیں کرتا اور تمام عورتوں سے نفرت کے مرض میں مبتلا ہو کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اگر عورتوں کی آبادی کو نابود کر دیا جائے تو دنیا ایک بہتر جگہ ہو جائے گی۔ وہ ہر رات ایک حسینہ سے شادی کرتا ہے اور پو پھٹے ایک رات کی دلہن کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ وزیر اعظم کے فرائض میں یہ شامل ہوا کہ وہ ہر شب شہریار کی سیج پر ایک نئی دلہن کو لا بٹھائے اور صبح ہونے سے پہلے اپنی نگرانی میں اسے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھے۔ ملک کی ہزار ہا لڑکیاں ایک رات کی دلہن بن کر قتل ہوئیں۔

یہ ایک ایسی المناک صورتحال تھی جو انتقام کی تمام حدوں سے گزر گئی۔ ہر گھر میں جوان بیٹیوں کی بے گناہ موت پر صفِ ماتم بچھ گئی۔ لوگ اس ظالم اور عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے والے بادشاہ سے نجات کی سوچنے لگے۔ اس نازک مرحلے پر جبکہ سیاسی اضطراب و انتشار اپنی حد کو پہنچ چکا تھا اور عوامی بغاوت کسی دن بھی رونما ہو سکتی تھی' وزیر اعظم کی بیٹی شہرزاد نے اپنی جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کیا اور باپ سے کہا کہ وہ شہریار کی دلہن بننا چاہتی ہے۔ گھر

میں کہرام مچ گیا۔ باپ جو دوسروں کی بیٹیوں کے قتل پر غم
زدہ تھا' اپنی بیٹی کو کس دل سے شہریار کی دلہن بناتا لیکن شہرزاد اپنی سی پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے شادی کی صرف ایک شرط رکھی اور وہ یہ کہ زندگی کی آخری شب اس کی چھوٹی بہن دنیا زاد کو بھی اس کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے۔ شہریار نے یہ شرط منظور کر لی اور شہرزاد نے شبِ عروسی گزار کر شہریار سے آخری خواہش کے طور پر اپنی بہن کو خلوت میں بلا کر ایک کہانی سنانے کی گزارش کی۔ شہریار اس بے ضرر خواہش پر بھلا کیوں معترض ہوتا۔ شاید وہ بھی انتقام کی یکسانی سے اتنا اکتایا ہوا تھا کہ اس کا جی بھی کہانی سننے کو چاہا ہو۔ یوں بھی پو پھٹنے میں ابھی دیر تھی اور شہرزاد کے پاس زندگی کی چند ساعتیں باقی تھیں اور یہاں سے داستان سرائی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو اس لیے دراز ہوتا رہا کہ شہریار نامکمل قصے کو اگلی رات مکمل سننا چاہتا تھا لیکن قصوں میں سے قصے نکلتے چلے گئے اور شہرزاد کی زندگی کی گھڑیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ شہریار کے ذہن کی گرہیں کھلتی رہیں اور عالمی ادب کا ایک شاہکار وجود میں آیا۔

بے وفائی کے جس عذاب سے بادشاہ شہریار گزرا تھا بالکل ایسی ہی صورتحال سے ہزاروں برس پہلے' قبل مسیح کے زمانے کا ایک فرعون بھی دوچار ہوا تھا۔ مصر اور عرب دنیا کے واحد نوبیل انعام یافتہ ادیب نجیب محفوظ نے اپنے نوبیل خطبے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''یہ واقعہ ایک بہت پرانے پیپرس پر لکھی ہوئی تحریر کے وسیلے سے ہم تک پہنچا کہ ایک فرعون کو معلوم ہوا کہ اس کے حرم کی کچھ عورتوں کے اس کے درباریوں سے تعلقات ہو گئے ہیں۔ توقع یہ تھی کہ اس زمانے کے رواج کے پیش نظر ان سب کو ختم کر دیا جائے گا۔ مگر' توقع کے برعکس' اس نے اپنی پسند کے قانون داں کو طلب کیا اور اسے اس بات کی تحقیق کا کام سونپا جو اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔ اس نے قانون داں سے کہا کہ وہ سچ جاننا چاہتا ہے تاکہ انصاف کے مطابق فیصلہ صادر کر سکے۔''
اب آپ کا جی چاہے تو ایک بت پرست اور ایک کلمہ گو بادشاہ کے طریقۂ عدل کا موازنہ کیجئے اور جی چاہے تو اس بات کو نظر انداز کر دیجئے۔

عرب دنیا کی بات تو ایک طرف رہی۔ برصغیر کا وہ کون سا پڑھا لکھا مسلم گھرانا ایسا ہے جس کے بچوں کے کان میں اذان کی آواز کے بعد الف لیلوی کہانیاں نہ پڑی ہوں۔ الہ دین کا

جادوئی چراغ، علی بابا چالیس چور، سند باد جہازی کے

ہوشربا سفر، قصہ سوتے جاگتے کا، پریاں، شاہ جنات، اڑن کھٹولے، کل کے گھوڑے۔ ہمارے گھروں کی ماؤں، نانیوں، دادیوں کے ساتھ ہی ناخواندہ مامائیں اور اصیلیں بھی ان کہانیوں سے واقف تھیں اور بچوں کو دودھ شہد کے گھونٹ پلانے کے ساتھ ہی ان کی سماعتوں کو ان کہانیوں سے سیراب کرتی تھیں۔

بیسویں صدی میں فلم اور ٹیلی وژن کا آغاز ہوا تو روسی، جاپانی، ہندی، انگریزی، فرانسیسی اور دوسری یورپی زبانوں میں الف لیلہ کی کہانیوں پر فلمیں بننے لگیں اور بچوں کیلئے ان کہانیوں کی رنگین باتصویر کتابوں کے ڈھیر لگ گئے۔ شہرزاد کی کہی ہوئی ہزار برس پرانی کہانیاں ساری دنیا میں پھیل چکی ہیں اور دنیا کا بچہ بچہ ان کہانیوں کی طلسماتی فضا میں سانس لیتا ہے۔

''الف لیلہ ولیلہ'' کہانیوں کا ایک ایسا سنہرا، روپہلا، لاجوردی، قرمزی اور بنفشئی جال ہے کہ جس کے اسیر کیا سلطان اور کیا دہقان، کیا مشرق اور کیا مغرب، کیا قدیم اور کیا جدید سب ہی ہوئے۔ ایک داستان کی دہلیز پار کیجئے تو دوسری داستان کی ڈیوڑھی میں قدم دھریے۔ ان داستانوں میں ہندوستان کی پنچ تنتر کتھا، جاتک کہانیوں کے دھارے آ کر ملتے ہیں۔ فارسی کی ہزار افسانہ ہے، کہیں سومیریوں کی داستان گل گامش کا عکس ہے اور کہیں عہد نامۂ قدیم کے کرداروں کا تذکرہ۔ ہارون الرشید اور جعفر برمکی بھی بغداد کے کوچہ و بازار میں پھرتے نظر آتے ہیں اور داستان پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے۔

الف لیلہ ولیلہ کے تحریری وجود کے متعلق سب سے پہلے نبیہ ایبٹ نے لکھا۔ نبیہ کو نویں صدی عیسوی کے چند اوراقِ شکستہ ملے جو الف لیلہ ولیلہ کی اولین شہادت ہیں۔ دسویں صدی میں ابن ندیم کی ''الفہرست'' میں فارسی داستانوں کے ایک مجموعے ''ہزار افسانہ'' کا ذکر ملتا ہے اور یہ بھی ابن ندیم ہے جو کہتا ہے کہ دسویں صدی کا الجہشیاری جو اپنی کتاب ''الوزراء'' کے لیے مشہور ہوا، اس نے عربوں، ایرانیوں، یونانیوں اور ہندوستانیوں کی 480 کہانیاں یکجا کیں۔ اس کا ارادہ ہزار کہانیاں جمع کرنے کا تھا لیکن اس سے پہلے راہیٔ ملک عدم ہوا۔ اسی لئے کچھ محققین الف لیلہ

ولیلہ کی تصنیف کا سہرا الجھشیاری کے سر باندھتے ہیں۔

دسویں صدی کا مؤرخ مسعودی اس کا تذکرہ کرتا ہے اور اسے ایرانی، ہندوستانی، یونانی ماخذوں سے نئے رنگ میں کہی جانے والی کہانیاں قرار دیتا ہے جو بغداد میں سنائی گئیں۔وہ کہتا ہے کہ یہ "الف خرفہ" ایک ہزار داستانیں تھیں جسے 'الف لیلہ ولیلہ' کے نام سے یاد کیا گیا۔ ابن ندیم جو اسے فارسی کی "ہزار افسانہ" کا ترجمہ کہتا ہے وہ ان کہانیوں کا نکتہ چیں ہے۔اس کے مطابق یہ بھدی اور ان گھڑ ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے بعد داستانوں کا یہ خزانہ سات صدیوں تک گم نام رہا۔ان سات صدیوں کے دوران اس کا صرف دو مرتبہ تذکرہ ملتا ہے۔ بارہویں صدی میں ایک یہودی کے بہی کھاتے میں تحریر ہے کہ "الف لیلہ ولیلہ مجید ابن العزیز کے پاس ہے"۔ اور دوسری مرتبہ پندرہویں صدی میں مصری مورخ المقرزی ان مصنفین کا حوالہ دیتا ہے جن کے کہنے کے مطابق گیارہویں صدی عیسوی میں یہ کہانیاں قاہرہ کی سراؤں اور بازاروں میں سنائی اور سنی جاتی تھیں۔

یہ صرف بادشاہوں اور وزیروں کی نہیں عام انسانوں کی کہانیاں ہیں۔کہیں کوئی کبڑا کوئی لنگڑا ہے، کہیں مچھلی تلنے اور چاک پر برتن بنانے والے ہیں، نان بائی، حمال، درزی، پنساری، شراب فروش، میوہ فروش، حجام، موچی، سوداگر، مزدور، ناخدا، سپیرا اور بقال ہیں۔ان کی زندگی کے دردناک پیچاک ہیں۔انسانی فطرت کا کون سا پہلو ہے جو ان کہانیوں کے دائرے سے بچ کر نکلا ہے۔عشق، حسد، رشک، چشمک، انتقام، احترام، بخیلی، دریا دلی، مردوں کی طرح آزاد عورتوں کی سجائی ہوئی لطف ونشاط کی محفلیں، انکی بے وفائیاں، کج ادائیاں، وفاداریاں۔کیا ہے جو ان کہانیوں میں نظر نہیں آتا۔

یہ داستان عربی زبان میں بیان ہوئی اور بعد کے زمانوں میں ضبط تحریر میں آئی، انگریزی، فرانسیسی، اردو، ہسپانوی، روسی، جرمن، پولش، ڈینش، اطالوی اور جانے کن کن زبانوں میں منتقل ہوئی۔اس داستان کے بارے، ہم نہیں جانتے کہ یہ کس نے بیان کی اور تحریری شکل میں کس نے

یکجا کیا۔ سچ یہ ہے کہ یہ کہانیوں' حکایتوں اور داستانوں
کے عشاق کے لیے ایک ایسا سبزہ زار ہے کہ اس کی سیر سے کبھی جی نہیں بھرتا۔ جس طور اجنتا اور ایلورا کے گم نام نقاش ہمارے لیے نقاشی کا بے مثال سرمایہ چھوڑ گئے' اسی طرح عرب داستان طرازوں کو ہمارا سلام کہ انہوں نے اپنے کم عقل اور بعض حالتوں میں فاتر العقل بادشاہوں کے ذہنی اختلال کے کیا کمال نقشے کھینچے اور انہیں آئینہ دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

آج کے زمانے میں جب کہ نسائی ادب اور نسائی تنقید کا شہرہ ہے عالمی شہرت یافتہ داستان الف لیلہ کی نئی تفہیم اور تفسیر عرب دانشوروں پر قرض ہے۔ فاطمہ مرنیسی نے یہی قرض اتارا ہے اور Scheherzad Goes West کے نام سے ایک بے حد دلچسپ کتاب تحریر کی ہے۔ یہ کتاب جو ''شہرزاد مغرب میں'' کے عنوان سے اردو میں شائع ہو رہی ہے اس میں فاطمہ مرنیسی نے 'الف لیلہ ولیلہ' کو ایک الگ زاویے سے دیکھا ہے اور مشرق و مغرب کی ذہین و حسین عورت کا موازنہ بہت پرُلطف انداز میں کیا ہے۔ مغرب جہاں آزادئ نسواں کی تحریک چلی اور جس کے اثرات ہم پر بھی مرتب ہوئے' اس داستان کے حوالے سے عرب مسلمان عورت ایک نئے رنگ میں نظر آئی ہے۔ فاطمہ نے اپنی کتاب میں شہریار کی تحلیل نفسی کا نکتہ بھی اٹھایا ہے۔ وہ شہرزاد اور شہریار کے تعلق کے بارے میں لکھتی ہے: ''کہانیاں سنا کر ایک ایسے جرائم پیشہ شخص کے ذہن کو بدل دینا جو آپ کے قتل پر تُلا ہوا ہے ایک غیر معمولی کارنامہ ہے' شہرزاد اگر بچ نکلتی ہے اور زندہ رہتی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ دانش و بینش سے کام لیتے ہوئے اعلیٰ ترین حکمت عملی تیار کرتی ہے۔ اگر وہ ہالی ووڈ کی کسی ہیروئن کی طرح بادشاہ کو خوش کرنے کی کوشش کرتی تو قتل کر دی جاتی۔ یہ شخص جنس کا طلب گار نہیں' اسے ایک نفسیاتی معالج کی تلاش ہے۔ وہ اپنی ذات سے بدترین کراہت کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس کیفیت میں لوگ اس وقت گرفتار ہوتے ہیں جب ان پر یہ بات آشکار ہوتی ہے یا وہ اس گمان میں گرفتار ہوتے ہیں کہ وہ ایک بے وفا بیوی کے شوہر ہیں۔ وہ اس لیے شدید طیش میں مبتلا ہے کہ صنف مخالف اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور یہ

بات بھی کہ اس کی بیوی نے اس سے بے وفائی کیوں
کی۔'' فاطمہ نے اس بات کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے کہ''اپنی ناطاقتی اور بے بضاعتی کے باوجود شہرزاد ایک گمبھیر اور پیچیدہ صورتحال کو بالکل درست طور پر سمجھ کر طاقت کا توازن بدل دیتی ہے اور بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ فاطمہ کہتی ہے کہ یہی وجہ ہے کہ میری طرح کی بہت سی عورتیں جو سیاست کے بارے میں کچھ بھی نہیں سمجھ پاتیں آج بھی شہرزاد کی ستائش کرتی ہیں......اس کا کہنا ہے کہ شہرزاد کے کردار کو اگر آپ درست سیاسی تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو وہ ایک موزوں کرداری نمونے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ رفتہ رفتہ ساری سلطنت کو بچالیتی ہے کیونکہ وہ اس سلطنت کے مالک ومختار بادشاہ کے ذہن کو بدل دیتی ہے......اس کی باطنی نفسی حالت پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ عورتوں کے خلاف اس کا طیش غلط تھا۔ وہ کہتا ہے''اے شہرزاد تُو نے مجھے اپنی بادشاہی کی صلاحیتوں کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا۔ ماضی میں عورتوں کے خلاف میں نے جو تشدد کیا اور جس طرح نوجوان لڑکیوں کو ہلاک کیا اس پر مجھے ندامت ہے۔''

یہ آخری جملہ جس میں ایک مطلق العنان بادشاہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اپنی بیوی سے اس کے مکالمے نے اس کا طرز فکر یکسر بدل دیا ہے۔اسی آخری جملے کی بنیاد پر بیسویں صدی کے متعدد مشہور عرب لکھنے والے شہرزاد کو اور اس کے وسیلے سے تمام عورتوں کو یہ رتبہ اور منصب دیتے ہیں کہ وہ مہذب اور شائستہ بنانے والیاں ہیں۔''

''الف لیلہ ولیلہ'' کی خوش بختی کہ اس کا ایک نسخہ عربی ادب پر فریفتہ ایک فرانسیسی دانشور اور محقق موسیو گالان کے ہاتھ لگا۔اس نے اسے سر پر رکھا' آنکھوں سے لگایا' اپنی آنکھوں کا تیل جلا کر اور اپنی زندگی کا ہر دن لگا کر اس بیش بہا داستان کو فرانسیسی میں منتقل کیا اور یہیں سے شہرزاد کے اس سفر کی داستان شروع ہوتی ہے جو فاطمہ مرنیسی نے لکھی ہے۔

فاطمہ مرنیسی 1940ء میں مراکش کے شہر فیض میں پیدا ہوئی اور آج دنیا میں وہ اہم مسلم

دانشور، مورخ اور فیمنسٹ کے طور پر شہرت رکھتی ہے۔

''قاہرہ ٹائمز'' نے اس کے بارے میں لکھا کہ ''وہ ہم عربوں کے لیے موجودہ دور کی شہرزاد ہے اور علم وادب کی اقلیم پر کسی داستانی ملکہ کی طرح حکومت کرتی ہے۔''

فاطمہ کو تحقیق اور تخلیق کو آمیز اور آمیخت کرنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ مراکش کی اس خوش نصیب نسل سے تعلق رکھتی ہے جو سیاسی ہیجان اور احتجاج کے دور میں پیدا ہوئی۔ اس کی ماں، نانیوں اور دادیوں کے لیے گھر سے قدم باہر نکالنا ممکن نہ تھا لیکن فاطمہ نے پہلے فیض پھر رباط میں تعلیم حاصل کی۔ اس کی ذہانت اس کے لیے بند دروازے کھولتی چلی گئی۔ اس نے فرانس کی سوربون یونیورسٹی سے علم سیاسیات اور پھر امریکا کی برانڈیز یونیورسٹی سے سوشیولوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ اس کے علمی کام پر اسے پرنس آف آسٹریا ایوارڈ اور Susan Sonutag ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس کی پہلی کتاب Beyond the Veil 'حجاب سے آگے' 1975ء میں شائع ہوئی۔ مسلم عورتوں بہ طور خاص عرب دنیا کی مسلمان عورتوں کے بارے میں اس کی یہ کتاب ایک کلاسک کا درجہ رکھتی ہے۔ گزشتہ 35 برسوں میں اس نے ''دنیائے اسلام کی فراموش شدہ ملکائیں''، ''اسلام اور جمہوریت: جدید دنیا کا خوف''، ''حدود شکنی کے خواب''، ''باغی عورتیں اور مسلمان حافظہ'' اور ''شہرزاد مغرب میں'' تحریر کی ہیں۔ وہ ایک ایسے دور میں اپنی خلاقی اور باغیانہ خیالات کے ساتھ عرب دنیا میں نمودار ہوئی جب ساری دنیا مسلمانوں اور بہ طور خاص عربوں کی طرف متوجہ تھی۔ اس نے فرانسیسی اور انگریزی کو ذریعہ اظہار بنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شمار عرب دنیا کے اہم ترین دانشوروں میں ہونے لگا۔ تضادات اور تنازعات میں گھری ہوئی آج کی مسلم دنیا کو فاطمہ مرنیسی جیسے دانشوروں کی ضرورت ہے جو مشرق و مغرب کے تصادم کو تہذیبی اور ثقافتی سطح پر مکالمے اور مباحثے کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کریں۔

زاہدہ حنا

(1)

پروں کے لباس والی عورت کی کہانی

اگر اتفاقاً آپ مجھے کاسابلانکا ائیر پورٹ پر یا طنجہ سے روانہ ہونے والی کسی کشتی پر دیکھ لیں تو آپ کا خیال یہی ہوگا کہ میں خود اعتماد ہوں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اب بھی جبکہ میری اتنی عمر ہوگئی ہے، میں سرحدیں عبور کرتے ہوئے خوفزدہ ہو جاتی ہوں، مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں اجنبی لوگوں کو سمجھ نہیں سکوں گی۔ میری دادی یاسمینہ جو ناخواندہ تھیں، ان کا کہنا تھا کہ ''سفر وسیلۂ ظفر ہے، سیکھنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں، یہ تمہیں مختار بناتا ہے۔'' وہ ایک حرم میں رہتی تھیں، ایک روایتی گھر جس کے دروازوں پر تالے پڑے رہتے تھے اور عورتیں انہیں کھول نہیں سکتی تھیں، ''جن اجنبی لوگوں سے تم ملو ان پر اپنی توجہ مرکوز رکھو اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم جس قدر کسی اجنبی کو سمجھو گی، اتنا ہی تم اپنے آپ سے آگاہ ہوگی اور اتنی ہی بااختیار ہوگی۔'' دادی یاسمینہ کے لیے حرم ایک زنداں تھا، ایک ایسی جگہ جسے چھوڑنے کی عورتوں کو ممانعت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سفر کی تعریف وتوصیف کرتیں اور متعین حدود یا سرحدوں کو عبور کرنے کے موقع کو ایک مقدس استحقاق جانتی تھیں، ناتوانی اور بے بسی سے نجات پانے کا بہترین طریقہ۔ قرون وسطیٰ کے شہر فیض میں جہاں میرا بچپن گزرا، وہاں یہ افواہیں عام تھیں کہ وہ منجھے ہوئے صوفی بزرگ جس پر انوار وتجلی

کے غیر معمولی کوندے لپکتے رہے اور جنھوں نے اپنے علم
اور اس کی شرح میں توسیع کی تھی' اس کا سادہ سا سبب وہ غیر ملکی تھے جو ان کی زندگیوں میں آئے
اور جن سے سیکھنے پر انہوں نے اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

چند برس پہلے مجھے اپنی کتاب ''حدود شکنی کے خواب: ایک حرم میں گزرنے والی داستانیں''
کی تعارفی اور تشہیری مہم کے لیے دس مغربی شہروں کا سفر کرنا پڑا۔ یہ کتاب 1994ء میں شائع
ہوئی اور اس کا 22 زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس سفر کے دوران 100 سے زیادہ مغربی صحافیوں نے
میرے انٹرویو کیے۔ ان ملاقاتوں کے دوران جلد ہی یہ بات مجھ پر آشکار ہوئی کہ یہ مرد حضرات
لفظ ''حرم'' استعمال کرتے ہوئے زیر لب مسکرا دیتے تھے ان کی اس ہنسی نے مجھے حد سے زیادہ
حیران کر دیا۔ کوئی شخص ایک ایسا لفظ ادا کرتے ہوئے ہنس کیسے سکتا ہے جو دراصل ''زنداں'' کا
مترادف ہے۔ دادی یاسمینہ کے لیے حرم ایک ظالمانہ ادارہ تھا' جس نے ان کے حقوق کو بے
طرح غصب کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اللہ کے تخلیق کیے ہوئے اس خوبصورت اور پیچیدہ سیارے
پر سفر کرنے اور اسے دریافت کرنے کے حق سے وہ محروم کر دی گئی تھیں۔'' دادی یاسمینہ نے
اسلام کے عارفوں' صوفیوں کے جس فلسفے کو اختیار کیا تھا' اسے میں نے بعد میں جانا اور اس کے
بعد مجھے ضرورت اس بات کی تھی کہ میں مغربی صحافیوں کے بارے میں حیرت زدہ ہونے کی
بجائے ان کے ساتھ صاف گوئی اور کشادہ دلی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے ان سے سیکھنے کی کوشش
کروں۔ اس روش کو اپنانے میں ابتدائی طور سے مجھے بہت مشکل ہوئی اور مجھے یہ گمان گزرنے
لگا کہ شاید بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے مجھ میں نئی حالتوں سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کم
ہو رہی ہے۔ میں اس بات سے خوفزدہ ہو گئی کہ میں بے لچک ہوتی جا رہی ہوں اور غیر متوقع
باتوں کو ہضم کرنا میرے لیے ممکن نہیں رہا ہے۔ کتاب کی تشہیری مہم کے دوران کسی کو میری
پریشانیوں کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ میں چاندی کے بھاری بربری کنگن پہنے رہتی تھی
اور میرے ہونٹوں پر شینیل کی سرخ لپ اسٹک نمایاں نظر آتی تھی۔

سفر سے سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اشاروں

اور پوشیدہ پیغامات کو سمجھ سکیں۔ دادی یاسمینہ جن کے خیال میں اردگرد کی دوسری عورتیں اس قابل نہ تھیں کہ انہیں صوفی روایات کے بارے میں کچھ بتایا جائے اس لیے وہ بہت رازداری سے میرے کان میں سرگوشی کرتیں ''تمہیں اپنے اندر استعداد پیدا کرنی ہوگی' آمادگی اور رضامندی کی حالت' اجنبی اپنے ساتھ جو سامان رکھتے ہیں' وہ ان کا مختلف ہونا ہے۔ اگر تم منتشر اور غیر مشابہہ معاملات پر اپنی توجہ مرکوز کرو تو تم بھی انوار و تجلی کا کوندا لپکتے ہوئے محسوس کرو گی'' اور پھر وہ مجھے چپکے سے یاد دلاتیں کہ اس بات کو راز ہی رکھنا ہے' اس کھیل میں رازداری بنیادی شرط ہے۔ ''یاد کرو کہ بیچارے حلاج کے ساتھ کیا ہوا تھا!'' حلاج ایک مشہور صوفی تھا جسے عباسی اہلکاروں نے 915ء میں گرفتار کرلیا تھا کیونکہ وہ بغداد کی گلیوں میں ''اناالحق'' ''میں سچ ہوں'' کہتا ہوا پھرتا تھا۔ ''حق'' خدا کے ناموں میں سے ایک ہے اسی لیے وہ زندیق قرار پایا۔ اسلام اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ خدائی کے اور انسان کے درمیان ایک ناقابل عبور فاصلہ ہے۔ لیکن منصور اس بات پر ایمان رکھتا تھا کہ اگر ہم خدا کے عشق پر اپنی توجہ مرتکز کریں اور کسی کو اس تک پہنچنے کا وسیلہ نہ بنائیں تو سماوی حدود کو مٹانا ممکن ہو جاتا ہے۔ عباسی حکام کے لیے حلاج کی گرفتاری مضطرب کر دینے والی بات تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خدا کی شبیہہ کے طور پر بنایا گیا ہے' اسے گرفتار کرنا خدا کی شان میں گستاخی ہوگی۔ اس کے باوجود وہ مارچ 992ء عیسوی کو زندہ جلا دیا گیا اور میں اس بات کی قائل ہوں کہ خودسوزی سے کہیں بہتر اور قابلِ ترجیح زندہ رہنا ہے۔ اس لیے میں نے سفر کے حوالے سے دادی یاسمینہ کی ہدایات کو مطلق راز میں رکھا۔ اور ان کے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے اتنی پرُعزم رہی کہ آج بھی سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے اور حد بندیوں سے گزرتے ہوئے میں خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

میرا بچپن دادی یاسمینہ سے یہ سنتے ہوئے گزرا کہ ایک عورت کے لیے یہ عام سی بات ہے کہ سمندروں یا دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے اس پر لرزہ طاری ہو جائے۔ ''ایک عورت جب اپنے

پنکھ استعمال کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو دراصل وہ بڑے
خطرات مول لیتی ہے۔'' وہ کہتیں اور پھر اس پر یہ اضافہ بھی کرتیں کہ اس کے برعکس اگر کوئی عورت اپنے بال و پر استعمال نہ کرے تو یہ بات اس کے لیے صدمے کا سبب بنتی ہے۔

دادی یاسمینہ کا جب انتقال ہوا تو میں تیرہ برس کی تھی۔ مجھے ان کی موت پر گریہ وماتم کرنا چاہیے تھا۔لیکن میری آنکھ سے آنسو نہ ٹپکا۔انہوں نے بستر مرگ پر مجھ سے کہا تھا''اپنی دادی کو یاد کرنے کا بہترین انداز یہ ہے کہ تم شہرزاد کی میری پسندیدہ کہانی سنانے کی روایت کو زندہ رکھنا '۔وہی پروں کے لباس والی عورت کی کہانی۔''یہی وجہ تھی کہ میں نے الف لیلہ ولیلہ کی ہیروئن شہرزاد کی کہی ہوئی یہ کہانی ازبر کرلی۔اس کہانی کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ایک عورت کو اپنی زندگی خانہ بدوشوں کی طرح گزارنی چاہیے'اسے ہر لمحہ چوکنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے خوہ اس سے محبت ہی کیوں نہ کی جارہی ہو۔یہ داستانیں ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ عشق تمہیں اپنے حصار میں لے لیتا ہے اور ایک زنداں بن جاتا ہے۔

19 برس کی عمر میں جب میں ریل میں سوار ہوئی اور میں نے محمد پنجم یونیورسٹی میں داخلے کے لیے رباط کا رخ کیا تو یہ میری زندگی کی خطرناک ترین حدود تھیں جنہیں میں نے عبور کیا۔ فیض جونویں صدی سے مذہبی تعلیم کا مرکز تھا اور قرون وسطیٰ کے بھول بھلیاں جیسے اپنے آبائی شہر سے میں ایک جدید شہر کی طرف جارہی تھی جو بحراوقیانوس کے کنارے واقع تھا اور جس کے داخلی دروازے ہمہ وقت کھلے رہتے تھے۔ مجھے ابتداء میں رباط سے خوف محسوس ہوا جس کی شاہراہیں وسیع وعریض تھیں۔ مجھے ان سے اتنا ڈر لگتا تھا کہ میں ان پر کمال کے بغیر چل نہیں سکتی تھی۔کمال میرا ساتھی طالب علم تھا اور فیض میں وہ میرے گھر کے قریب رہتا تھا۔کمال بار بار اس بات کو دہراتا کہ وہ اپنے بارے میں میرے جذبات کو سمجھ نہیں پاتا اور الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا شاید تمہیں میری ضرورت ہے تا کہ تم سارے مراکش سے رباط میں یونیورسٹی کے داخلے کے لیے جمع ہو جانے والے ہزاروں

مردوں کے اور اپنے درمیان مجھے حد فاصل کے طور پر

استعمال کرسکو۔'' ان دنوں مجھے کمال کی اس بات سے سب سے زیادہ جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ وہ میرے ذہن کو پڑھنے کی ناقابل یقین صلاحیت رکھتا تھا' اسے پسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دادی یاسمینہ کی کہانی اسے زبانی یاد تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ الف لیلہ ولیلہ کے باضابطہ شائع شدہ ایڈیشن میں یہ کہانی جس طرح بیان کی تھی اسے وہ یاد تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ دادی یاسمینہ جیسی ناخواندہ عورتیں' پڑھی لکھی عورتوں سے کہیں زیادہ تخریبی مزاج رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہی ہیں جنھوں نے کہانیوں میں بدعتی تحریف کی۔ وہ قصے اور داستانیں زبانی سناتی تھیں تاکہ احتساب سے بچ سکیں کمال کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ زبانی روایات تھیں جنھوں نے بڑے سے بڑے جابر اور مطلق العنان حکمران کو بے بس و مجبور کردیا تھا۔

کمال کے کہنے کے مطابق دادی یاسمینہ نے اپنی اس محبوب داستان میں پہلی تحریف یہ کی تھی کہ اس کے عنوان کو نسائی رنگ دے دیا تھا۔ کتابی صورت میں شائع ہونے والی الف لیلہ ولیلہ میں اس کہانی کا عنوان ''حسن البصری کی داستان'' ہے۔ بصرہ جنوبی عراق کا وہ شہر ہے جو بحیرہ روم اور چین جانے والی تجارتی شاہراہوں کے درمیان واقع ہے لیکن وہ داستان جو مجھے ورثے میں ملی تھی اس کا عنوان تھا ''پروں کے لباس والی عورت'' اور وہ مسلم سلطنت کے دارالخلافہ بغداد سے تعلق رکھتی تھی۔ حسن جو ایک شاندار اور عاشق مزاج نوجوان تھا' اس نے اپنی ساری دولت شراب وشباب پر گنوا دی تھی اور اب وہ اپنی قسمت آزمانے کے لیے بغداد سے اجنبی جزیروں کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ ایک رات وہ ایک بلند چھت سے سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا جب اس کی نظر ایک بہت بڑے پرندے پر پڑی جس کی پرواز بہت باوقار تھی اور جو ساحل پر اتر گیا تھا۔ اچانک اس پرندے نے اپنا لباس اتار دیا جو پروں سے بنایا گیا تھا اور ساحل پر اسے ایک حسین اور بے لباس عورت نظر آئی جو تیزی سے سمندر کی لہروں میں اتر گئی اور تیرنے لگی' وہ دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ حسین تھی......اس کا دہانہ خاتم سلیمان کی طرح جادو اثر اور اس کی

زلفیں شب دیجور سے زیادہ سیاہ...... اس کے ہونٹ مرجان جیسے تھے اور دانت موتیوں کی لڑی......اس کا پیٹ شکن در شکن تھا اور اس کی پنڈلیاں سنگ مرمر کے دوستونوں کی طرح تھیں۔'' لیکن حسن بصری کا جس چیز نے دل موہ لیا وہ اس کے رانوں کے درمیان تھی: ''یوں جیسے دوستونوں پر چاندی یا بلور کا پیالہ رکھا ہو۔'(1)

حسن اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا اور جب وہ سمندر میں تیر رہی تھی اس دوران حسن نے پروں سے بنا ہوا اس کا لباس چرایا اور ایک خفیہ مقبرے میں دفن کر دیا۔ اپنے شہ پروں سے محروم ہو کر وہ حسن کی قیدی بن گئی۔ حسن نے اس سے شادی کر لی اور اس پر ریشم اور ہیرے جواہرات کی بارش کر دی اور جب وہ اس کے دو بیٹوں کی ماں بن گئی تو حسن کی عنایتیں اس پر کم ہو گئیں۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ پرواز کا خیال بھی کبھی دل میں نہیں لائے گی۔ وہ اپنی دولت میں اضافے کے لیے دور دراز کے سفر کرنے لگا۔ ایک روز جب وہ سفر سے لوٹ کر آیا تو یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ اس کی بیوی جو شاید ہمیشہ اپنے پروں کی تلاش میں رہی تھی وہ اپنا لباس ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اسے پہن کر پرواز کر گئی تھی۔ ''اپنے دونوں بیٹے سینے سے لگا کر اور اپنے پروں کے لباس میں خود کو لپیٹ کر وہ خدا کے حکم سے جو عظیم ہے' پرندہ بن گئی۔ اس نے تمکنت سے اپنے قدم اٹھائے' پھر رقص کرتے ہوئے اس نے اپنے پنکھ پھڑ پھڑائے''(2) اور گہرے دریاؤں اور متلاطم سمندروں پر سے اڑتے ہوئے اپنے آبائی جزیرے ''وک وک'' جا پہنچی۔ اڑان بھرنے سے پہلے وہ حسن کے لیے ایک پیغام چھوڑ گئی تھی: اس نے کہا تھا کہ اگر اس میں ہمت ہو تو اس کے تعاقب میں آ سکتا ہے۔ اس وقت کسی کو معلوم نہیں تھا اور آج بھی لوگوں کو بہت کم معلوم ہے کہ ''وک۔وک'' کی سرزمین جس میں پرائے کو اپنانے اور دور دراز کی اجنبیت کو اپنے اندر سمو لینے کا رجحان ہے کہاں واقع ہے۔ نویں صدی کے عرب مورخ اور Golden Meadows کے مصنف مسعودی کا کہنا ہے کہ وہ زنجبار سے پرے مشرقی افریقہ میں ہے۔ مارکو پولو' وک وک کو امیزون یا سکورٹا کے' عورتوں کے جزیرے' سے تعبیر کرتا ہے۔ کچھ دوسرے

وک وک کو سیکیلس، مڈغاسکر یا ملاکا میں بتاتے ہیں۔ کچھ
کے خیال میں وہ چین یا انڈونیشیا (جاوا) میں واقع ہے۔(3)

کمال کے کہنے کے مطابق دادی یاسمینہ نے اس کہانی میں جو دوسری تخریب وتحریف کی وہ اس کا پرُمسرت اختتام تھا۔میری دادی کی کہانی میں حسن بے تابی سے اس پراسرار سرزمین وک وک کو ڈھونڈتا رہتا ہے لیکن نہ وہ سے تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور نہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو دوبارہ حاصل کر پاتا ہے۔لیکن مردوں نے الف لیلہ ولیلہ کا کتابی شکل میں جونسخہ مرتب کیا ہے اس کے مطابق حسن اپنی بیوی اور بیٹوں کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔وہ انہیں بغداد واپس لے کر آتا ہے جہاں وہ سب ہمیشہ ہمیشہ ایک پرمسرت زندگی گزارتے ہیں۔کمال نے مجھے بتایا کہ مرد، خودمختار عورتوں کی طرف بے اختیار کھنچے چلے جاتے ہیں اور ان کے عشق میں گرفتار ہوجاتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ اس بات سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ کہیں وہ ان کو چھوڑ کر چلی نہ جائیں اور یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی اس کہانی کے دادی یاسمینہ والے اختتام کو ناپسند کرتا تھا۔''تمہاری باغی دادی اس کہانی کا جوانجام بیان کرتی تھیں، وہ دراصل اس بات پر اصرار تھا کہ یہ عورتوں کا حق ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو چھوڑ کر تجارت یا دوسرے کاموں کے لیے دور دراز کے سفر پر روانہ ہوجائیں۔تم ہی بتاؤ کہ کیا یہ طرز زندگی مسلمان گھرانوں کو مستحکم بنیادوں پر قائم رکھ سکتا ہے؟'' دادی یاسمینہ کو حسن کے خاندان کا مسائل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے ان پر چوٹیں کرنا کمال کا پسندیدہ مشغلہ ہوگیا تھا۔میں جب بھی ایک تنہا عورت کے طور پر کسی دعوت نامے کو قبول کرنا چاہتی یا تنہا کہیں کے لیے روانہ ہوجاتی تو اس طرح وہ اپنے حسد کا اظہار کرتا۔وہ مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا رہتا کہ کاش ہم بھی قرون وسطی کے بغداد کے باسی ہوتے جہاں مردعورتوں کو حرم میں قید کر سکتے تھے۔''تمہارے خیال میں ہمارے مسلمان آباؤ اجداد نے بلند دیواروں والے محل اور اندرونی آنگنوں والے باغیچے اپنی عورتوں کو قید کرنے کے لیے کیوں بنائے تھے؟ صرف تنگ آمد بجنگ آمد کی ذہنی حالت میں مبتلا مرد ہی ایسا کر سکتے تھے جنہیں اس

بات کا یقین ہو کہ عورتوں کے شانوں پر پنکھ ہوتے ہیں۔
تب وہ حرم جیسی خوفناک عمارت کو وجود میں لا سکتے ہیں۔ ایک ایسا زنداں جسے محل کے طور پر پیش کیا جائے۔''

ہم دونوں کے درمیان یہ گفتگو اکثر اٹھتی جو مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں تھی' اس کے دوران ہر مرتبہ کمال کو پرسکون کرنے کے لیے یاد دلاتی کہ عیسائی مغرب میں مرد اپنی عورتوں کو حرم میں قید نہیں رکھتے لیکن بجائے اس کے کہ میری یہ بات اسے مطمئن کرتی وہ اور زیادہ برافروختہ ہو جاتا۔
''مجھے نہیں معلوم کہ مغرب کے مردوں کے ذہن کس طور سوچتے ہیں لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ وہ بھی اپنی عورتوں کے لیے حرم تعمیر کرتے اگر انہیں نظر آتا کہ عورتیں ایک بے لگام اور قابو میں نہ آنے والی طاقت ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مغرب والوں کے واہموں اور تصورات میں عورتوں کے پنکھ نہ ہوتے ہوں' ہم اس بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟''

ہمارے طالبعلمی کے برسوں میں ''پروں کے لباس والی عورت'' نے کمال اور میرے درمیان پرشور اور برانگیختہ کرنے والی بحثوں کو جاری رکھا بلکہ جب ہم بڑے ہوئے اور محمد پنجم یونیورسٹی میں ایک ساتھ پڑھانے لگے اس وقت بھی یہ مجادلہ جاری رہا۔ ہم دونوں کے شعبے مختلف تھے کمال قرون وسطیٰ کا عربی ادب پڑھ کر نکلا تھا جبکہ میں نے سوشیولوجی میں ڈگری لی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان اس بات کی تفہیم بہت اہمیت اختیار کر گئی کہ ہم اپنی زبانی روایت کی طاقت وتوانائی کو سمجھیں اور اسے جدید عرب دنیا کی حرکیات کو سمجھنے کے لیے حکمت عملی کے ایک اوزار کے طور پر استعمال کریں۔ 1970ء کی دہائی میں ہمارے وہ طلباء جن کی اکثریت کا سابلا نکا اور رباط کی ان جھونپڑیوں اور کچی آبادیوں سے آئی تھی جہاں نہ بجلی اور نہ ٹیلی ویژن' ان کی باتیں سنتے ہوئے اور ان سے مکالمہ کرتے ہوئے ہم نے اپنی ماؤں کی کہانی کہنے کی طاقت وتوانائی کو دوبارہ سے دریافت کیا۔ اگر ہماری متوسط اور طبقۂ اعلیٰ کے طلبہ کی مائیں کہانی کہنے کے ہنر سے محروم ہوگئی ہیں اور ان کے بچے ہالی ووڈ کی تصوراتی کہانیوں کا شکار ہوگئے ہیں تو ہماری کم خوش

نصیب اکثریت کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ میں سوشیالوجی
پڑھنے والے طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتی کہ وہ سلسلہ کوہ اطلس اور صحارا کے ریگستان کی دور دراز بستیوں سے نانیوں' دادیوں اور ماؤں کی کہانیوں کو جمع کر کے لائیں' پھر میں ادب کے ماہرین سے کہتی کہ وہ ان کہانیوں کی رمزیت اور ان میں چھپی ہوئی باتوں کو تلاش کرنے میں میری مدد کریں۔ اس سے وہ نئے مواقع پیدا ہوئے جن کی وجہ سے کمال اور میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے' ایک دوسرے سے جھوجھتے رہتے اور ہر وقت ایک دوسرے کے مؤقف کی تردید کرتے۔ یہاں تک کہ دھواں دھار علمی مباحث کے درمیان صوفیوں اور عارفیوں کے پراسرار انوار کی طرح ہمارے باطن بھی منور ہوئے۔

ہم دونوں کو اور ہمارے طلباء کو جس بات نے الجھن میں مبتلا کیا وہ یہ تھی کہ سینہ بہ سینہ چلی آنے والی ان زبانی داستانوں میں زیادہ ذہین وہ صنف ہے جسے تسلیم کرنے پر ہمارے مذہبی صاحبان اقتدار و اختیار مشکل سے ہی تیار ہوں گے' اگر مسلمانوں کے مذہبی قوانین مردوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ عورتوں پر بالادست رہیں تو ہماری زبانی روایتوں میں سچ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔

اپنی کتاب کی یادگار تشہیری مہم کے سلسلے میں جب میں مغربی صحافیوں کی متجسس نگاہوں کے روبرو ہوئی' اس وقت سے زیادہ کبھی بھی میرے ذہن میں کمال سے ہونے والی پرشور بحثیں ابھر کر نہ آئیں۔ یہ صحافی یہ شبہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ میں میک اپ اور چاندی کے بھاری زیورات پہننے والی اپنے آپ کو کس قدر ناتواں محسوس کر رہی تھی جلد ہی مجھ پر اپنے ناتواں اور کمزور ہونے کا سبب آشکار ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں اجنبی لوگوں کے بارے میں بہت کم جانتی تھی اور ان کے واہموں اور خیالوں کے بارے میں تو شاید کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔☆☆

(2)

جنس اور مغربی حرم

اپنی کتاب کی تشہیری مہم سے پہلے مجھے کبھی اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ مسکراہٹ انسان کے اندرونی جذبات کو بےطرح آشکار کر دیتی ہے۔ بہت سے مغربی لوگوں کی طرح عرب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آنکھیں انسان کے باطنی جذبات کی عکاس ہوتی ہیں۔ ابن حزم جسے عشق کو سمجھنے کا ملکہ حاصل تھا' اس کا کہنا تھا کہ "آنکھیں روح کا صدر دروازہ ہوتی ہیں۔ وہ رازوں کو پرکھ لیتی ہیں اور انسان کی گہرائیوں میں موجود خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں" (1) میں جب بڑی ہو رہی تھی تو مجھے سکھایا گیا کہ ایک عورت کو اپنی نگاہ ہمیشہ نیچی رکھنی چاہیے تاکہ مرد اس کے خیالات سے واقف نہ ہوسکیں۔ عرب عورتوں کی نام نہاد شرم و حیا دراصل ان کی جنگی حکمت عملی ہے لیکن اپنی کتاب کی تشہیری مہم کے دوران مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ مسکراہٹ بھی انسان کا راز اسی طرح کھولتی ہے جس طرح آنکھیں' اور اس کے کئی مختلف انداز ہوتے ہیں۔ ان تمام صحافیوں کی مسکراہٹیں ایک جیسی نہیں تھیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنی قومیت کے مطابق اپنی ملی جلی کیفیتوں کا اظہار کر رہا تھا۔

جہاں تک مسکراہٹ کا تعلق ہے ہم مغرب کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ تقسیم امریکیوں اور یورپیوں کے درمیان ہے۔ امریکی مردوں کے چہرے پر لفظ "حرم" سے خالص

اور سچی شرمندہ سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔ امریکیوں

کے لیے اس لفظ کے جو بھی معنی ہوں اس کا کوئی نہ کوئی تعلق احساس شرم سے تھا۔ اس کے برعکس اگر یورپی مرد شمال سے تعلق رکھتے ہوں تو ان کے لبوں پر ایک مہذب اور پرُتکلف ہنسی ہوتی تھی اور اگر وہ جنوب کے ہوں تو ان کی مسکراہٹ میں جذبات کا وفور جھلکتا تھا۔ ان مسکراہٹوں میں نازک سا فرق ہوتا تھا اوراس کا تعلق اس بات سے تھا کہ متعلقہ صحافی بحیرۂ عرب سے کتنے قریب یا کتنے فاصلے پر رہنے والا ہے' فرانسیسی' ہسپانوی اور اطالوی مردوں کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور انداز عاشقانہ ہوتا۔ ہالینڈ کے سوا اسکینڈے نیوین اور جرمن حیران وپریشان رہ جاتے۔ ''کیا تم واقعی کسی حرم میں پیدا ہوئی تھیں؟'' وہ حیران لہجے میں مجھ سے پوچھتے۔ان کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی ہوتیں اوران میں تشویش اورالجھن کے تاثرات ہوتے۔

میری کتاب کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے کہ ''میں ایک حرم میں پیدا ہوئی تھی۔'' اس مختصر سے جملے میں کوئی پراسرار سا مسئلہ تھا' کیونکہ ہر کوئی بلاتفریق اور بے دھڑک مجھ سے پوچھتا۔ ''تو کیا واقعی تم ایک حرم میں پیدا ہوئی تھیں؟'' سوال کرنے والے کی نگاہیں مجھ پر اس طرح جمی ہوتیں کہ جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ سوال کرنے والے کے خیال میں اس جملے سے کسی قسم کا شرمناک راز وابستہ ہے اور وہ یہ ہرگز نہیں چاہے گا کہ میں اس کے سوال سے کنی کترا کر نکل جاؤں۔ ادھر میں تھی کہ جس کے لیے لفظ ''حرم'' خاندان کے ادارے کے مترادف ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ میں اس لفظ کو پرُ مزاح نہیں سمجھ سکتی۔عربی میں لفظ ''حرام'' کی اصل جس سے لفظ ''حرم'' نکلا ہے لغوی معنوں میں گناہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایسی خطرناک سرحد جہاں مقدس قوانین اور لذتوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ''حرام'' وہ ہے جسے مذہبی قوانین ممنوع قرار دیتے ہیں اور جس کی ضد ''حلال'' ہے یعنی وہ کچھ جو روا اور جائز ہے۔ تاہم یہ بات عیاں ہے کہ جب لفظ ''حرم'' سرحدیں عبور کر کے مغرب میں داخل ہوتا ہے تو اس کی خطرناک دھار کند ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مغربی لوگ اس لفظ کو سن کر کسی قسم کی بندش یا دباؤ

کے احساس کے بغیر بشاشت کا اظہار کیوں کرتے؟ ان
کے حرم میں جنس تشویش سے آزاد ایک رویہ ہے۔

کتاب کے لیے بار بار انٹرویو دیتے ہوئے مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں ایک گمبھیر اور ڈرامائی انداز کی صورتحال میں پھنس گئی ہوں جس کا کسی کتاب کی عام سی اور روزمرہ ہونے والی تشہیری مہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں یہ جواب دوں گی کہ ''ہاں۔ میں ایک حرم میں پیدا ہوئی تھی''۔ تو میں اپنے اور اپنے انٹرویو کرنے والوں کے لیے فوری طور سے مسائل پیدا کرلوں گی۔'' میں اس الجھن میں مبتلا ہوگئی کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ میرے ساتھ اگر عجیب سے واقعات پیش آنے لگیں تو میری نسائی حس نہایت تیزی سے کام کرنے لگتی ہے۔ یہی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ ان مسکراہٹوں میں کہیں ایک ایسی زیریں جنسی لہر چل رہی تھی جسے میں نہیں سمجھ سکتی تھی۔ مجھ سے سوال کرنے والے صحافی اپنی چشم تصور سے ایک ایسا حرم دیکھ رہے تھے جو میری نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

میں نے پیرس میں اپنی فرانسیسی ایڈیٹر کرسٹین کو فون کیا تاکہ اس بارے میں ایک مغربی عورت کا نقطہ نظر جان سکوں۔

''تم درست سمجھتی ہو ان کی مسکراہٹوں کا تعلق جنس سے ہے'' اس نے جواب دیا پھر کہنے لگی۔ ''تم انہیں زیادہ سے زیادہ بولنے پر کیوں نہیں اکساتیں؟''

اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے کردار میں تبدیلی لانی ہوگی اور وہ صحافی جو میرا انٹرویو لے رہے ہیں، مجھے چاہیے کہ میں ان کا انٹرویو لینا شروع کردوں۔ اب جب کوئی صحافی اپنے جوش اور وفور کا اظہار کرتا میں فوراً میٹھے لہجے میں اس سے پوچھتی ''تم مسکرا کیوں رہے ہو؟'' یا ''حرم کے بارے میں کون سی بات تمہیں اتنی پُرلطف محسوس ہو رہی ہے'' اس دوطرفہ مکالمے سے یہ ہوا کہ میرا انٹرویو کرنے والے مجھے معلومات بہم پہنچانے لگے۔ اور یہ بات انہوں نے مجھے سکھائی کہ ہم لوگ ایک چیز کے بارے میں بات نہیں کر رہے تھے۔ مغربی لوگوں کا حرم کچھ

تھا اور میرا حرم کچھ اور، اور ان دونوں کے درمیان کوئی
قدر مشترک نہیں پائی جاتی تھی۔

بہ ظاہر مغربی لوگوں کا حرم بے پناہ رنگ رلیوں کا ایک ایسا جشن، ایک ایسی ضیافت اور ایک ایسا معجزہ تھا جو مردوں کو شاد کام کرتا تھا جہاں وہ کسی مزاحمت یا مشکل کے بغیر ان عورتوں سے جنسی لذتیں حاصل کر سکتے تھے جنہیں انہوں نے اپنی کنیزوں میں بدل دیا تھا۔ جبکہ مسلمان مرد حرم میں اپنی کنیز عورتوں سے اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کی شدت سے مزاحمت کریں اور انہوں نے لطف و لذت کے جو منصوبے بنائے ہیں انہیں ساقط کر دیں۔ مغرب والے حرم کی ان تصویری شبیہوں کا بھی حوالہ دیتے تھے جو روغنی تصویروں یا فلموں میں نظر آتی ہیں جبکہ میں حقیقی محلوں کو چشم تصور سے دیکھ سکتی تھی، وہ حرم جنہیں صاحب اقتدار مردوں یعنی خلیفہ سلطان اور امیر و کبیر تاجروں کے حکم سے تعمیر کیا گیا، جن کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور پتھروں سے بنائی گئی تھیں۔ میرے حرم کا تعلق تاریخی حقیقتوں سے تھا جب کہ ان کے تصور میں آباد حرم مشہور مصوروں انگریس، ماتیس، ڈیلا کرویکس، یا پکاسو کی بنائی ہوئی وہ فنکارانہ شبیہیں تھیں جن میں انہوں نے عورتوں کو زر خرید کنیزوں یا لونڈیوں کی سطح پر اتار دیا تھا۔ یا پھر ان کے ذہن میں ہالی ووڈ کے ان ہنر مند فلم سازوں کی بنائی ہوئی فلمیں تھیں جن میں انہوں نے حرم کی عورتوں کو ناکافی لباس میں ملبوس بیلے رقص کرتی ہوئی، ان رقاصاؤں کی طرح پیش کیا تھا جو اپنے قید کرنے والوں کو خوش کرنے میں مسرت محسوس کرتی تھیں۔ کچھ صحافیوں نے وردی کے اوپیرا ''ایڈا'' کا اور کچھ نے دیاغی لیو کے بیلے ''شہرزاد'' کا بھی ذکر کیا۔ لیکن یہ صحافی خواہ کسی بھی شبیہ کا حوالہ دیتے، وہ ہمیشہ حرم کو ایک ایسی پرُشہوت داستانی جگہ کے طور پر بیان کرتے جہاں مسرت آمیز جنس کی فراوانی ہوتی اور یہ خدمت وہ برہنہ عورتیں فراہم کرتیں جو اس بات پر ہشاش بشاش رہتیں کہ انہیں قید کر دیا گیا ہے۔

مغربی مردوں کے منہ سے یہ تفصیلات سن کر مجھے یہی خیال آیا کہ یہ تو کسی معجزے کی بات

کرتے ہیں۔مسلمان مرد مصوروں نے حرم کی تصویر کشی
کرتے ہوئے اور اسے ہوس رانی کی مسرتوں کی جگہ بناتے ہوئے مغربی لوگوں سے کہیں زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ مینا طوری تصویروں میں یا داستانوں اور ادب میں مسلمان مرد عورتوں سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ حرم کے نظام میں پائی جانے والی اپنی غیر مساوی صورتحال کا بہ خوبی ادراک رکھتی ہوں گی چنانچہ وہ اپنے قید کرنیوالوں کی خواہشات کی پرُ جوش انداز میں تکمیل نہیں کریں گی۔

متعدد مسلمان درباروں میں وہ مصور ملازم رکھے جاتے تھے جو آرٹ کی کتابوں کو مینا طوری تصویروں سے مصور کرتے تھے۔ یہ مینا طوری تصویریں نہ دیواروں پر آویزاں کی جاتی تھیں اور نہ عجائب گھروں میں ان کی نمائش ہوتی تھی۔ یہ امیر اور طاقت ور افراد کے ذاتی ذخیروں کی زینت ہوتیں اور وہ جب چاہتے ان سے لطف اندوز ہوسکتے تھے۔ بہت سے مغربی لوگوں کے تصورات کے برعکس اسلام میں جاندار چیزوں کی تصویر کشی پر پابندی کے باوجود مسلمان معاشروں میں سیکولر تصویر کشی کی ایک شاندار روایت موجود ہے۔اس روایت کے مطابق تصویروں میں مذہبی رسوم کی عکاسی یا نمائندگی قطعاً ممنوع ہے۔ آٹھویں صدی سے مختلف مسلمان بادشاہتوں نے مسلسل تصویر کشی کی روایت جاری رکھی اور اس کام پر خطیر رقم خرچ کی۔ اموی شہزادوں نے اپنے عشرت کدے قصائر عامرہ کو بڑے بڑے فریسکوز سے آراستہ کر رکھا تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں جو بحیرہ مردار سے متصل ہے اور سابق شرق اردن کا حصہ کہلاتا ہے۔جبکہ سولہوی صدی میں ایران کے صفوی خاندان نے میناطوری تصویر کشی کو اپنے عروج پر پہنچا دیا تھا۔ یہ وہ میناطوری تصویریں تھیں جن میں سے بیشتر میں اساطیری داستانوں اور عشقیہ شاعری کو مصور کیا گیا تھا۔ان میں شاعروں اور مصوروں دونوں کو یہ مواقع حاصل تھے کہ وہ عورت کے عشق، وفور جذبات اور ان معاملات سے وابستہ خطرات کو اپنے تخیل کے مطابق مصور کر سکیں۔

میناطوری تصویریں ہوں یا ادب، دونوں میں مسلمان مردوں نے عورتوں کو فعال حصہ دار

کے طور پر دکھایا۔ جبکہ مغربی مردوں مثلاً انگریس، ماتیس، اور
پکاسو نے انہیں برہنہ اور مفعول دکھایا ہے۔ مسلمان مردوں نے حرم کی عورتوں کا جو خیال باندھا اس میں وہ تیز گھوڑوں پر سواری کرتی ہوئی، تیر کمان سے مسلح اور دبیز شلوکے یا کرتیاں پہنے نظر آتی ہیں۔ انہوں نے حرم کی عورتوں کو سرشور جنسی شریک کے طور پر مصور کیا۔ مجھے اندازہ یہ ہوا کہ مغرب والے حرم کو ایک ایسا پرسکون عیش باغ سمجھتے ہیں جہاں مرد مؤدب اور حکم بجالانے والی عورتوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ جبکہ مسلمان مرد اپنے حرم میں خود کو غیر محفوظ بتاتے ہیں، خواہ یہ خطرات حقیقی ہوں یا تصوراتی۔ اس کے برعکس مغربی مرد اپنے آپ کو ہیرو کے طور پر پیش کرتے ہیں جنہیں عورتوں سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ مسلم حرم میں عورت سے خوف اور مردوں کے اپنے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہونے کی جو المناک کیفیت ہے، وہ مغربی حرم میں نہیں پائی جاتی۔

اپنی کتاب کی تشہیری مہم کے دوران میری جن نہایت باتونی صحافیوں سے ملاقات ہوئی وہ بحیرۂ روم کے آس پاس رہنے والے تھے۔ وہ حرم کو احمقانہ قہقہوں اور آزار پہنچانے والے انداز میں یوں بیان کرتے کہ ''یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں حسین عورتیں جنسی قرب کے لیے مہیا ہوتی ہیں۔'' بہت سے شائستہ اور مہذب فرانسیسی حرم کا تعلق ان تصویروں سے جوڑتے جن میں طوائفوں کے بازار کی نقش نگاری کی گئی تھی۔

یہ 1894ء "Au Salon the de la rue des Moulins" اور 1879ء میں ایڈگر ڈیگاس کی "The Client" تھیں۔ اسکینڈے نیویا کے مرد اس ''ممنوع لفظ'' کا ذکر کرتے ہی جھینپی ہوئی ہنسی ہنستے اور ان کے چہرے سرخ پڑ جاتے۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ تہذیب کا تقاضہ یہ ہے کہ شرمسار کرنے والے کچھ موضوعات پر گفتگو سے گریز کیا جائے۔ ہالینڈ کے مرد اس اصول پر پورے نہیں اترتے تھے۔ وہ فرانسیسی اور اسپینش مردوں کی طرح پہلے تو قہقہے لگاتے اور اگر ان کی ذرا سی حوصلہ افزائی کی جاتی تو ان تفصیلات میں چلے جاتے جن کے مطابق حرم کی

خواتین کے کڑھت والے ریشمی لباس، لمبی اور الجھی ہوئی
زلفوں کے ساتھ پشت کے بل، صبر وتحمل سے منتظر حالتوں میں دراز ہوتیں۔

کئی امریکی صحافی حرم میں رہنے والی عورتوں کا ذکر ہالی ووڈ کی فلموں میں دکھائی جانے والی کنیز رقاصاؤں کی طرح کرتے۔ ان میں سے ایک تو ایلوس پریسلے کے ایک گیت کو گنگنانے لگا۔ اس فلم میں ایلوس پریسلے کو عربی لباس میں اس وقت گاتے ہوئے دکھایا گیا تھا جب وہ 1965ء کی ایک فلم Harum Scarum میں حرم کے اندر گھستا ہے تا کہ وہاں سے ایک حسینہ کو آزاد کرا سکے۔

میں وہاں تک جاؤں گا جہاں صحرا کا سورج ہے اور جہاں لطف ہے
وہاں تک جہاں حرم کی لڑکیاں رقصاں ہیں
وہاں تک جہاں عشق ومحبت ہے......
مختصر سی بات یہ ہے کہ نوجوانو مشرق کی طرف چلو

جہاں تم کسی شیخ کی طرح خود کو امیر اور بارعب محسوس کرو گے، جہاں رقصاں لڑکیاں تمہارے اشارۂ ابرو کی منتظر ہوں گی۔

جنت جب آواز دے تو میں کسی خیمے میں رینگ جاؤں گا
اور داد عیش اس طرح دوں گا جس طرح جی چاہے
مشرق کی طرف جاؤ، کھاؤ، پیو اور موج اڑاؤ
نوجوانو! مشرق کا رخ کرو (2)۔

پیرس میں کام کرنے والے امریکی صحافی جم کا روزگار فلموں پر تبصرے سے وابستہ تھا۔ مشرق کے بارے میں بننے والی پرشہوت فلم کے بارے میں اس سے مجھے ایک ایسا طرز بیان سننے کو ملا جس سے میں اس وقت تک ناواقف تھی اور یہ انگریزی کے دو حرف "t" اور "s" تھے۔ "t" پستان کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "s" ریت کے لیے۔(3) ہم اس وقت ''الہ دین'' کی

ڈزنی فلم پر گفتگو کر رہے تھے جو 1992ء میں خلیج کی جنگ کے کچھ ہی دنوں بعد آئی تھی۔ اس تذکرے کے دوران ایک دوسرے صحافی نے اس فلم کا ابتدائی گیت گنگنانا شروع کر دیا۔(4) دوسرے امریکیوں کو 1917ء اور 1918ء میں بننے والی ٹوینتھ سنچری فوکس کی فلمیں Aladdin and His Lamp اور Ali Baba and the Forty Thieves یا 1920ء کی Kismet یاد آ گئی۔ جبکہ The Theif of Baghdad کو امریکی مردوں کی نفسیات میں ایک امتیازی تہذیبی نشان کہا جا سکتا ہے۔ کچھ نے 1924ء کی ڈگلس فیئربینکس کی فلم کا حوالہ دیا' کچھ 1940ء کی فلم کا ذکر کرتے رہے اور بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے اس کہانی کے اس ورژن کے بارے میں بات کی جس میں اسٹیو ریوز نے کام کیا تھا اور فرانسیسی اور اطالوی میں بنی تھی۔ 1978ء میں بننے والی وہ ٹیلی فلم بھی زیر بحث آئی جس میں بغداد کے خلیفہ کا کردار پیٹر اوسٹینوف نے ادا کیا تھا۔ ایک زیادہ بڑی عمر کے صحافی نے مسکراتے ہوئے اور اپنی خیالی مونچھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے 1921ء میں بننے والی فلم The Sheikh کو یاد کیا جس میں رڈولف ویلنٹینو نے کام کیا تھا۔

میں جب کسی حرم کا تصور کرتی ہوں تو میرے ذہن میں ایک گنجان آباد جگہ آ جاتی ہے۔ جہاں ہر شخص دوسرے پر نگران ہے۔ مسلمان حرم میں شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے لیے بھی یہ بہت مشکل ہے کہ وہ قربت کے لیے کسی خلوت کو تلاش کر سکیں۔ اور جہاں تک حرم کی شادی شدہ عورتوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے جنسی شادکامی ناممکن ہے۔ کیونکہ ان مردوں کے ساتھ انہیں سینکڑوں ناآسودہ اور نامراد عورتوں کی شراکت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ حرم ایک ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو شہوانی ترنگ اور سرور مل سکتا ہے تو اس سے زیادہ کوئی غلط نہیں سوچ سکتا۔ حرم کی تہذیب کا لازمی جز شہوانی جذبات کو انگیخت کرنے والی غذائیں ہیں۔ اگر کوئی مرد ان اشیا کا بھرپور استعمال کرے تب بھی وہ سب کی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتا۔ درباری وقائع نویسوں سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سے بے پناہ مسحور ہو جانے والے عشاق

بھی بس اپنی کسی ایک محبوب ترین عورت سے بار بار
قربت کر سکتے ہیں، وہ بھی اس وقت تک جب ان کی جوانی اور مردانگی برقرار رہی ہو۔ جبکہ ان کی دوسری بیویوں اور داشتاؤں نے اپنی محرومیوں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مغربی مرد اپنے ذہن میں حرم کا دلکش اور شہوانی خیال کیسے قائم کر سکتے ہیں؟

مغرب میں حرم کا جو تصور پایا جاتا ہے اس میں عورتوں کے پنکھ نہیں ہوتے، ان کے پاس نہ گھوڑے ہوتے ہیں اور نہ تیر۔ مسلمان حرم کے برعکس مغرب کے حرم میں شدید جنسی کشمکش نہیں ہوتی۔ جس کے دوران عورتیں مزاحمت کرتی ہیں، مردوں کے منصوبوں کو تلپٹ کرتی ہیں اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ آقا بن بیٹھتی ہیں اور خلفا اور سلاطین سب کو الجھن اور کشمکش میں گرفتار کر دیتی ہیں۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی میناطوری تصویروں میں ایسی ہی ایک عورت زلیخا ہے۔ یہ میناطوری تصویریں ایرانی، ترک یا مغل مصوروں نے بنائی ہیں ان میں بائبل کی داستان یوسف یا قرآن میں بارہویں سورۃ، سورۂ یوسف کی زلیخا ہے۔ یہ کہانی مصر کے پس منظر میں بیان ہوئی ہے۔ زلیخا جو ایک پختہ کار عورت اور ایک سربرآوردہ مرد پیوتی فر کی بیگم ہے۔ وہ شاندار اور نوجوان یوسف کے عشق میں دیوانگی کی حد تک گرفتار ہو جاتی ہے۔ یوسف کو اس کا شوہر اپنے گھر لاتا ہے اور یہی توقع رکھتا ہے کہ وہ اسے اپنا بیٹا تصور کرے گی۔ ان میناطوری تصویروں میں زلیخا کو جارحانہ جنسی انداز میں پاکباز یوسف کو ہراساں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یوسف اس کی پیش دستیوں کی معجزاتی طور پر مزاحمت کرتا ہے اور یوں ماحول کا امن وامان برقرار رکھتا ہے۔ ان میناطوری تصویروں میں ایک شادی شدہ اور ناآسودہ عورت کے امکانی طور پر ناجائز تعلق قائم کرنے کی المناک کوششوں کی بازگشت دکھائی دیتی ہے۔ قرآن میں اس مشہور داستان کے بنیادی واقعات بیان کیے گئے ہیں تاہم یہ ایک عجیب بات ہے کہ مسلمان مصوروں نے ان واقعات سے متاثر ہونے کی بجائے فارسی کے دو دیوزاد شاعروں فردوسی اور جامی کی مثنویوں

سے استفادہ کیا ہے۔ ان دونوں نے ''مثنوی یوسف وزلیخا'' لکھی۔ فردوسی کی مثنوی 1010ء کے آس پاس لکھی گئی اور جامی نے یہ مثنوی 1483ء کے قریب لکھی۔ (5) یہ دونوں مثنویاں جو مقدس اور ڈرامائی عنصر رکھتی ہیں، ان دونوں کا اختتام حیران کن حد تک مختلف ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان یہ بات مشترک ہے کہ زلیخا قاعدے قانون کو بے اثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور انتشار اور افراتفری کو قائم کرتی ہے۔(6)

ہمیں مثنوی کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاہم افسوس کہ میں فارسی سے نابلد ہوں اس لیے فردوسی اور جامی کو براہ راست نہیں پڑھ سکتی لیکن میں جب بھی قرآن کی بارہویں سورۃ پڑھتی ہوں تو اس کی شاعری اتنی طاقتور ہے کہ مجھ پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ بارہویں سورۃ میں بیان کیا گیا ہے کہ یوسف جو ایک شاندار نوجوان ہے وہ کس طرح جنسی ہراسانی کا شکار ہوتا ہے'' اور وہ جو اس کے گھر میں تھا اسے ایک شیطانی عمل پر ورغلایا گیا۔ اس نے دروازے بند کر دیے اور اسے اپنی طرف بلایا۔ اس نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں'' (سورۃ 12:23) (7) عربی میں جو طرز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ بہت واضح ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ زلیخا نے یوسف کو جنسی طور پر ہراساں کیا۔

سورۃ یوسف کا آغاز تجسس کی کیفیت سے ہوتا ہے۔ جس میں پڑھنے والے کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ایک پہیلی بوجھے: کس نے کس کے ساتھ دست درازی کی؟ یوسف جس کے کرتے کا دامن پھٹا ہوا تھا۔ تو کیا یہ زلیخا تھی جس نے پاکباز یوسف کی طرف جسمانی پیش قدمی کی؟ (12:26) یا یہ یوسف تھا جس نے زلیخا کی طرف پیش دستی کی؟ اس بارے میں حیران نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان مصوروں نے اس داستان کو اتنے تواتر سے پیش کیا ہے۔ اس کا موضوع حرام کاری سے زیادہ اس کے ہونے کا امکان ہے۔ مرد شادی کے قوانین بنا سکتے ہیں اور انہیں تقدس کا درجہ دے سکتے ہیں لیکن اس بات کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ عورتیں خود کو ان قوانین کا

پابند خیال نہیں کریں گی۔ یہ معمولی سا امکان کہ عورتیں
احکامات کی پاسداری نہیں کریں گی اور مردانہ نظام کو غیر مستحکم کردیں گی، مسلمان تہذیب کی تاریخی حقیقت اور خیال آرائی کا ایک نہایت پُراثر اور ڈرامائی عنصر ہے۔

جیسا کہ اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ زلیخا جو بدکار ہے وہ اس مراعت سے محروم رہتی ہے کہ قرآن میں اس کا نام آئے۔ اس کا ذکر محض "اس عورت" کے طور پر کیا جاتا ہے۔ ایک انتہا پسند فرقہ جو "اجاردہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے کہ سورۃ یوسف قرآن کا حصہ ہے۔ بارہویں صدی کے ایک ایرانی مصنف شہرستانی لکھتا ہے کہ اجاردہ کا کہنا ہے کہ "کوئی عشقیہ کہانی قرآن کا حصہ نہیں ہوسکتی" (8) اگر عشق کو مسلمہ نظام ودستور کے لیے ایک خطرہ تصور کرلیا جائے تب تو یہ ایک منطقی بات محسوس ہوتی ہے لیکن یہ اسلام کی نہیں، انتہا پسندی کی منطق ہے۔ دونوں کے درمیان اس تفریق کو سمجھنا نہایت اہم ہے۔ اگر ہم ان واقعات ومعاملات کو سمجھنا چاہتے ہیں جو آج کی مسلم دنیا میں پیش آرہے ہیں۔ یہ ایک سچ ہے کہ آج وہ مسلمان انتہا پسند موجود ہیں جو افغانستان اور الجزائر کی گلیوں میں عورتوں کو قتل کردیتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ ان کی وجہ ان کی انتہا پسندی ہے۔ یہی انتہا پسند ان مسلمان صحافیوں کو بھی ماردیتے ہیں جو ان سے مختلف خیالات کے اظہار پر اصرار کرتے ہیں اور جو سیاسی حرکیات میں تکثیریت یعنی ایک سے زیادہ اصولوں کا تعارف کراتے ہیں۔ اسلام ایک قانونی اور تہذیبی نظام کے طور پر اس خیال سے متاثر ہے کہ عورت ایک ایسی قوت ہے جس پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ چنانچہ وہ مرد سے مختلف ایک ایسا "دوسرا" نامعلوم ہے جسے جانا نہیں جاسکتا۔ آج انڈونیشیا سے ڈاکار تک مسلمان پارلیمنٹوں میں عورتوں کے حقوق کے حوالے سے اگر ہذیانی نہیں تو جو بہت پُرجوش بحثیں ہورہی ہیں وہ دراصل تکثیریت کی بحثیں ہیں۔ یہ مسلسل اور متشدد بحثیں عورتوں پر مرتکز ہیں کیونکہ عورتیں مسلمانوں یعنی مسلم امہ کے درمیان اجنبی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ امام خمینی جنہوں نے 1979ء میں خلاف قیاس طور پر ایران

کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا' ان کا پہلا حکم عورت کو نقاب
پہننے کا تھا۔ انتخابات؟ سر آنکھوں پر لیکن تکثیریت یعنی ایک سے زیادہ اصولوں کو معاشرے میں راہ دینا؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انہیں اندازہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ایک بے پردہ عورت امام کو اس حقیقت کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ''امہ'' یعنی ایمان والوں کی برادری ہم جنس اور ہم اصل نہیں ہے۔

اسلامی سماج میں سیاستدان تقریباً ہر کام خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں لیکن ابھی تک کوئی بھی رہنما اپنے حامیوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکا کہ وہ اسلام کے اس مرکزی وصف سے منکر ہو جائے کہ وہ صنف' نسل اور عقائد کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں کے درمیان مکمل مساوات کا اصول رکھتا ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح اسلام میں بھی عورتیں مسلمان مردوں کے برابر ہیں حالانکہ انہیں ایک اقلیت کا درجہ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان کے قانونی حقوق محدود ہیں اور انہیں فیصلہ کرنے کے عمل سے باہر رکھا گیا ہے۔ زیادہ اسلامی ملکوں میں عورتیں ان ملکوں کے فیصلہ کرنے والے اداروں میں حصہ دار ہو سکتی ہیں لیکن یہ حصہ داری بالواسطہ ہے۔ ان کے قانونی حقوق ذمیوں یا مذہبی اقلیتوں جیسے ہیں اور پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی ''ولی'' یا ''وکیل'' کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ ''ولی'' یا ''وکیل'' اور دوسرے معنوں میں نمائندہ چونکہ لازمی طور پر ایک مسلمان مرد ہوتا ہے۔ اس لیے عورتیں اور اقلیتیں پردۂ اخفا میں رہتی ہیں تاکہ یکساں اور ہم نسل ہونے کی کہانی زندہ رہے۔

آج کی مسلم دنیا کی حرکیات کو سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کوئی بھی مساوات کے اصول کو معرض بحث میں نہیں لاتا کیونکہ یہ ایک الہامی ادراک تصور کیا جاتا ہے۔ جس بات پر بحث ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی روشنی میں بننے والی شریعت بدلی جا سکتی ہے یا نہیں۔ بحث اس بات پر ہے کہ یہ قوانین ''کس'' نے بنائے ہیں۔ اگر یہ قوانین مردوں نے بنائے ہیں تو متن کی نئے سرے سے تشریح ہو سکتی ہے اور اصلاح ممکن ہے' لیکن انتہا پسند جو قوانین کو جمہوری

بنیادوں پر بنائے جانے کے مخالف ہیں وہ اس بات کا
دعویٰ کرتے ہیں کہ ''شریعت'' بھی قرآن کی طرح الوہی ہے اس لیے اسے تبدیل نہیں کیا
جاسکتا۔

قرآن کی تاریخیت کے مصری عالم ابوزید کا وہ بدنام زمانہ مقدمہ بھلا کون بھلا سکتا ہے
جس کے اختتام پر ایک بنیاد پرست مصری جج نے اگست 1996ء میں انہیں ملحد وزندیق قرار دیا
تھا۔ یہ اس ڈرامائی تصادم کی محض ایک مثال ہے جو ایک جمہوریت دوست اجتہادی گروہ اور انتہا
پسندوں کے درمیان جاری ہے۔ اجتہاد کی بات کرنے والوں کا کہنا ہے کہ شریعت میں اصلاح
کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ انسان کی بنائی ہوئی ہے جبکہ انتہا پسند اس بات کے مخالف ہیں۔

عورتیں اس بحث کا مرکز ہیں کیونکہ جنسی نابرابری کی جڑیں شریعت میں ہیں۔ اس کے
باوجود نہایت جوشیلے انتہا پسند بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ عورتیں کم تر ہیں۔ مسلمان عورتوں کی پرورش
برابری کے ایک گہرے اور مستحکم احساس کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انتہا پسندی کے
باوجود کئی مسلمان ملکوں میں عورتیں سیاسی رہنماؤں کے طور پر ابھری ہیں۔ پاکستان میں بے نظیر
بھٹو، ترکی میں تانسو شلر اور میگاوتی انڈونیشیا میں۔ اس کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ
یونیورسٹیوں اور پیشہ ورانہ میدان میں متعدد ایسے شعبے جنہیں مردوں کے لیے مخصوص سمجھا
جاتا ہے مثلاً انجینئرنگ ان میں مسلمان عورتیں جوش وخروش سے داخل ہوئی ہیں۔ حالانکہ انہیں
تعلیم حاصل کرنے کا موقع ابھی بہت حال میں میسر آیا ہے۔ 1990ء کی دہائی میں یونیورسٹیوں
یا ان کے مساوی دوسرے اداروں میں پڑھانے والی مصری خواتین کا تناسب فرانس اور کینیڈا
سے زیادہ تھا(9) ۔ اسی طرح ترکی اور شام میں انجینئرنگ کے شعبے میں داخلہ لینے والی لڑکیوں
کی تعداد انگلستان اور نیدر لینڈ کی نسبت دگنی تھی (10)۔ الجزائر اور مصر میں انجینئرنگ پڑھنے
والی لڑکیاں کینیڈا یا اسپین کی لڑکیوں کی نسبت کہیں زیادہ تھیں''۔

گلوبلائزیشن نے مسلمان ریاستوں اور شہریوں دونوں کو اس بات پر مجبور کردیا ہے کہ وہ

اپنے آپ کو نئے سرے سے دریافت کریں' نئے تہذیبی
تشخص کی تخلیق کریں جس کی جڑیں مذہب سے زیادہ اقتصادیات میں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات کی پیش گوئی کرنا بہت آسان ہے کہ آنے والی دہائی میں عورتیں کہیں زیادہ شدید مباحث کو اٹھائیں گی۔ نسوانیت' اندر موجود ہونے والے خطرے کی نشاندہی کرتی ہے جبکہ گلوبلائزیشن کے بارے میں ہونے والی بحث باہر کے خطرے کا پتہ دیتی ہے۔ اور یہ دونوں بحثیں لامحالہ اور لازماً عورتوں پر مرکوز رہیں گی۔ تمام خلل انداز اور درہم برہم کرنے والی طاقتوں کا بنیادی اور جذباتی نکتہ نسائیت ہے' خواہ یہ طاقتیں حقیقی ہوں یا ان کا تعلق تصوراتی دنیا سے ہو اور اب میں پھر اپنی کتاب کی تشہیری مہم کی طرف پلٹتی ہوں۔ اس کے دوران مغربی حرم میں نسائیت کا کسی خطرے کے طور پر غیر موجود ہونا میرے لیے مسحور کن تھا۔

جلد ہی اس رمز یا پہیلی کو بوجھنے کی کوشش میرے لیے پرُلطف ثابت ہونے لگی اور میرے ذہن پر طاری ہوگئی۔ میں اسے پرُلطف اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس دوران اجنبی لوگوں سے گفتگو اور سفر سے سیکھنے کا رویہ میرے لیے پرُمسرت ثابت ہوا' یہ ویسا ہی ذہن کو روشن کرنے والا تجربہ تھا جس کا وعدہ صوفیوں اور دادی یاسمینہ نے مجھ سے کیا تھا۔ یونیورسٹی کی مجھ جیسی ایک پروفیسر جس کے بیشتر دن لائبریریوں میں گزرتے ہوں جہاں مکمل سکوت چھایا رہتا ہے یا جو کچھوے جیسی رفتار سے چلنے والے انٹرنیٹ رابطوں سے الجھتی رہتی ہو'اس کے لیے مغرب کے پرسکون اور آرام دہ کیفے یا شاندار کتاب گھروں میں غیر ملکیوں سے باتیں کرنا ایک سنسنی خیز اعزاز تھا۔ میں جلد ہی اس راز سے بھی آگاہ ہوگئی کہ اپنی آگہی اور روشن خیالی میں اضافے کے لیے اپنی سننے کی صلاحیت میں اضافہ ضروری ہے۔ لیکن اس کام کا آغاز کہاں سے کیا جائے؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنی خود پسندی اور رعونت سے نجات حاصل کریں یا کم سے کم اس کی کوشش کریں اور اس کے ساتھ ہی دوسروں کا احترام کریں۔ کسی مغربی فرد کا احترام کرنا ایک مسلمان کے لیے بڑی مہم سر کرنے کے مترادف ہے ہنرمندی کا مظاہرہ سمجھ لیجئے' اس کی وجہ یہ

ہے کہ مغربی تہذیب ہماری روز مرہ زندگی میں اس قدر
زیادہ جاری وساری ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے تو ہم بہ خوبی واقف ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب میں مغربی صحافیوں کے روبرو تھی اور اپنے آپ کو نہتا یا عاجز محسوس کر رہی تھی اس وقت مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہم مسلمان مغربی لوگوں کو بطور انسان بہت کم جانتے ہیں۔ وہ تضادات' امیدوں' آرزوؤں اور تشنہ خوابوں کا مجموعہ ہیں۔ اگر ہم مغربی لوگوں کو نہتے اور عاجز افراد کے طور پر دیکھ سکیں تو ہم ان سے زیادہ قربت محسوس کریں گے۔ لیکن ہم مغرب والوں کو سپر مین سے گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ ہم انہیں ناسا کے ان روبوٹ جیسے ماہر سائنسدانوں سے مشابہ سمجھتے ہیں جن کے سینے میں دل نہیں ہوتا اور جو اپنے تمام جذبات و احساسات کو غیر انسانی اور بے تحاشہ مہنگے خلائی جہازوں کی تعمیر میں لگا دیتے ہیں تا کہ وہ کائنات میں دور دراز کی کہکشاؤں کا کھوج لگائیں جبکہ وہ اپنے کرۂ ارض کو نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں۔

مجھ پر جب اس بات کا انکشاف ہوا کہ تو میں اپنی جگہ سے ہل کر رہ گئی کہ ایک مغربی مرد کی مسکراہٹ مجھے عدم استحکام میں مبتلا کر سکتی ہے کیونکہ میں تو اسے ایک امکانی دشمن سمجھے بیٹھی تھی۔ میں نے تو اسے اس کی انسانیت سے بھی محروم کر دیا تھا۔ مجھ پر جب اس بات کا انکشاف ہوا تو میں دہشت زدہ رہ گئی کہ میری تمام صوفی وراثت مجھے اس واضح وحشیانہ عمل سے محفوظ نہ رکھ سکی کہ میں اجنبی لوگوں کے احترام میں کمی نہ کروں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آخر کار میری یہ کتاب میرے لیے شفا بخش بھی ثابت ہوئی اور اس نے مجھے مالا مال بھی کیا۔ حالانکہ راہ میں بہت سی مشکلیں آئیں۔

مغربی حرم کی ماہیت کے بارے میں جاننے کی مجھ پر طاری ہو جانے والی کیفیت نے مجھے موقع دیا کہ میں اپنے پرانے مغربی دوستوں سے تعلقات کو مزید استوار کروں اور اس کے ساتھ ہی نئے دوست بناؤں۔ اس حوالے سے میں دو صحافیوں کا خاص طور سے ذکر کروں گی۔ ان میں سے ایک برلن میں کام کرنے والا ہانس ڈی اور پیرس کا جیکوئس ڈیویاں ہے۔ یہ دونوں

میرے دوست بن گئے۔ ان دونوں نے مجھے نہایت فراخ دلی سے متعلقہ کتابیں، بنیادی تصویریں اور اپنے قیمتی خیالات بہم پہنچائے۔ جس کی وجہ سے میرے لیے یہ سمجھنا ممکن ہوا کہ میں نسائیت کی طاقت کو سمجھ سکوں جو مشرق اور مغرب کے درمیان ایک حد فاصل کی طرح حائل ہے

ہانس ڈی نے مجھے ''شہرزاد'' نامی بیلے دیکھنے کی دعوت دی۔ اس نے بیلے پر تبصرہ کیا اور ایک جرمن استاد کی طرح ماہرانہ اور بھرپور انداز میں مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مغربی حرم کا خیالی تصور اس بات سے وابستہ ہے کہ وہاں کی عورتیں کس قدر اطاعت شعار اور فرماں بردار ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ مغربی حرم کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ اس کے برعکس جیکوئس نے پیرس والوں کے مخصوص پرلطف انداز میں اپنا مضحکہ آپ اڑاتے ہوئے یہ بات کہی کہ آج کی سنجیدہ گفتگو میں اس بات کا اعتراف ڈرا دینے والا ہے کہ کم سے کم تصورات کی دنیا میں اسے وہ عورت مسحور کرتی ہے جس سے گفتگو کرتے ہوئے کسی قسم کی دانشورانہ گفتگو نہ ہو۔ اپنے تبصروں سے اس نے مجھ پر مغربی حرم کی دوسری امتیازی خصوصیت واضح کی اور وہ یہ تھی کہ عورتوں سے دانشورانہ تبادلۂ خیال شہوانی لطف اندوزی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ جبکہ حقیقی یا تصوراتی مسلم حرم میں عورتوں سے ذہنی زور آزمائی لطف کی انتہا تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ تو کیا مغرب میں معاملات اتنے مختلف ہیں۔؟ میں اس بات پر حیران ہوتی رہی کہ کیا شہوانی ردعمل میں تہذیبیں احساسات وجذبات کے حوالے سے مختلف انداز اختیار کرتی ہیں؟ ان حیران کن انکشافات نے مجھے اس قدر بوکھلا دیا کہ میں نے بنیادی باتوں کے بارے میں پھر سے کھوج لگانا شروع کیا۔ میں نے لغتوں کے ذریعے دونوں تہذیبوں کے حوالے سے ابتدائی الفاظ کے مفاہیم تلاش کرنے شروع کیے۔ ''کنیز''، ''خواہش''، ''حسن''، ''دل گیری''، ''جنسی لذت'' جیسے الفاظ کے معنی میں دیکھتی رہی اور مغربی مردوں کی باتیں غور سے سنتی رہی کہ اس بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔

(3)

مغربی حرم کی سرحدوں پر

آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ کسی جرمن کتاب گھر میں کتابیں دیکھتے ہوئے میری سرخوشی کا کیا عالم ہوتا ہے۔ یہاں آپ کتابوں کی ورق گردانی کر سکتے ہیں اور دکان کے مختلف کونوں میں رکھے ہوئے اسٹولوں پر بیٹھ کر آرام سے انہیں پڑھ بھی سکتے ہیں۔ یہ اسٹول ان دکانوں میں اسی مقصد کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس رباط میں اگر آپ کسی کتاب کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کریں تو ہوسکتا ہے کہ دکان کا مالک آپ کو دکان سے باہر نکال دے۔ کسی کتاب کو کھولنے کی لذت سے لطف اٹھانے کے لیے آپ کو کتاب خریدنی پڑے گی۔ ایک ایسا ملک جہاں چیزیں خریدتے ہوئے اشیا کو اٹھا کر دیکھنا' مول تول کرنا خریداری کا بنیادی اصول ہے۔ وہاں کتابیں شاید واحد شے ہیں جن پر ان روایتی طریقوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ آپ وہاں کتابوں کو نہ چھو سکتے ہیں اور نہ بھاؤ تاؤ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی کتاب گھروں میں مجھے بے اندازہ مسرت ہوتی ہے اور اسی لیے میں رباط میں پہلا ایسا کتاب گھر کھولنے کا خواب دیکھتی ہوں جس میں کیفے بھی ہو۔

وہ برلن کی ایک یادگار سہ پہر تھی جب ہانس ڈی نے مجھے اپنے ذاتی حرم میں باریابی کی اجازت دی۔ وہ برلن جیسے پرشور شہر میں معجزاتی حد تک خاموش ایک جگہ تھی جس کا نام

Savigny Platz آرٹ بک اسٹور تھا۔ اس اسٹور میں ہانس کے محبوب مصنفین کی کتابیں تھیں۔ پہلی کتاب جو اس نے منتخب کی وہ Scenes Orientales تھی۔ اس میں معاصر عورتوں کی برہنہ تصویریں تھیں۔ جو ایک مرد فوٹوگرافر نے اتاری تھیں۔ جن میں ان عورتوں نے 1862ء کی انگریس کی Turkish Bath(1) اور ایسی ہی دوسری مشہور تصویروں میں دکھائے جانے والے حرم کے مناظر کو نہایت اہتمام کے ساتھ کوریوگراف کیا تھا۔

اس کتاب کے بارے میں جس بات نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا وہ اس کی قیمت تھی جو 30 ڈالر تھی۔ یہ حیرت شاید تیسری دنیا سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ہو۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر ہانس سے پوچھا کہ کیا اتنی مہنگی کتاب کے خریدار یہاں معقول تعداد میں موجود ہیں؟ اس نے اثبات میں سر ہلایا ''ہاں یقیناً''۔ اس مصنف کا نام الیگزینڈر ڈیو پوئے تھا۔ یہ نام مجھے فرانسیسی لگا اس کا پبلشر جرمن تھا اور یہ حال میں ہی یعنی 1998ء میں شائع ہوئی تھی۔ کتاب کا متن جرمن اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں تھا۔ ''یورپین بعض اساسی چیزوں پر ایک دوسرے سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ مثلاً گائے اور مرغی کے گوشت پر'' ہانس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لیکن حرم کے بارے میں ہمارے تصورات ہمارے اتحاد کا ایک بڑا سبب ہیں''

اس کی بات سن کر میرے منہ سے ایک زوردار قہقہہ نکل گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں شرمسار ہو گئی کیونکہ وہاں موجود دوسرے خریدار پلٹ کر مجھے دیکھ رہے تھے اور میرے ہاتھ میں ایک ضخیم کتاب تھی جس کا سرورق ایک عریاں تصویر سے مزین تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں رباط سے 2 ہزار میل کی دوری پر Savigny Platz میں ہوں۔

طمانیت کے اس احساس کے ساتھ میں نے کتاب کو واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا اور فرمانبرداری کے ساتھ اپنے استاد کے پیچھے چلی جو اب فن تعمیر کی کتابوں کو دیکھ رہا تھا۔

ہانس ایک سیڑھی پر چڑھ کر سب سے اوپر کے
خانے سے ایک کتاب اتار لایا۔ یہ 1930ء کی چھپی ہوئی تھی اور اس کا نام The Harem: An Account of the Institution as It Existed in the Palaces of the Turkish Sultans تھا یہ کتاب N.M Penzer نے لکھی تھی۔ ہانس کا کہنا تھا کہ اس کتاب کی ابتدائی سطروں میں ''حرم'' کو جس طور بیان کیا گیا ہے' مغربی لوگوں کے تصورات میں آج بھی حرم کے وہی خدوخال ہیں۔

پنزر نے لکھا ہے کہ ''میں نے کم عمری میں ترکیہ کے حرم کے بارے میں سنا اور ہمیں یہی بتایا گیا کہ یہ ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں سینکڑوں حسین و نازنین عورتیں تالوں میں بند رکھی جاتی ہیں تا کہ وہ صرف اپنے آقا کی تسکین کر سکیں اور جب ہم بلوغت کی حدوں کو پہنچتے ہیں تو ان ابتدائی معلومات میں کم اضافہ ہوتا ہے......ہم میں سے بہت سے ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ سلطان جو ہے...... بلکہ ہوتا تھا ایک بوڑھا بداخلاق عیاش شخص جو اپنا سارا وقت حرم میں بسر کرتا تھا' اس کے اردگرد کا ماحول عطریات کی تیز خوشبو سے معطر رہتا' ہلکی موسیقی اور ٹھنڈے پانی کے چشموں کے درمیان وہ سینکڑوں نیم برہنہ حسیناؤں کے جھرمٹ میں رہتا اور حسد کی ماری' قربت کے لیے ترستی ہوئی عورتوں کا ذہن اپنے آقا کی لذت کوشی کے لیے تصور میں آنے والے ہر ممکن سامان عیش و راحت کو بہم پہنچانے کے لیے سرگرداں رہتا''۔(2)

پنزر کی لکھی ہوئی یہ سطریں پڑھ کر میں حیران رہ گئی کہ اسے ان عورتوں کے حسد سے ذرا سا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا حالانکہ یہ بات اس نے غیر مبہم طور پر لکھی تھی۔ یہ عورتیں قرب کے لیے ترستی ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ عورتیں جو ذہانت سے اور صورتحال کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم رکھی جاتیں تب حسد ان عورتوں کو اس بات کی ترغیب دیتا کہ وہ اپنے آقا کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ یہ ایک لازمی بات ہے کہ جب عورتوں کو ذہن دیا جائے گا تو مسائل لازماً اٹھیں گے۔ مسلم حرم کی ایسی کئی ذہین عورتیں تھیں جو اپنی فطری ضرورتوں سے محروم

رکھی گئیں اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کے اور دوسری
عورتوں کے درمیان جو مقابلہ ہے وہ انصاف پر نہیں بلکہ تصنع پر مبنی ہے۔ کئی ایسی چہیتی بیگمات اور کنیزیں تھیں جنہوں نے اپنے خلیفہ کو گلا گھونٹ کر یا زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ عباسی سلطنت کی بنیادیں رکھنے والا خلیفہ مہدی حرم میں پائے جانے والے اسی حسد کا مشہور شکار ہے۔ وہ اگست 785ء کی ایک خوبصورت سہ پہر اپنی چہیتی کنیزوں میں سے اس ایک کے ہاتھوں ختم ہوا جو اس پر دل و جان سے فدا تھی۔ حرم کے مالک و آقا کا ایک بہت بڑا مسئلہ اس کی جذباتی کیفیات کا مکمل طور پر شفاف ہونا ہے۔ ہر فرد یہ جانتا ہے کہ اس لمحے اس کی محبوب ترین عورت کون ہے۔ منظور نظر پسندیدگی کے اس منصب کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے آقا کی ایک ایک بات پر نظر رکھتی ہے اور بعض اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے کہ خود آقا کو اس بات کا ادراک نہیں ہوتا کہ اس کی نظر کرم کسی اور کی طرف منعطف ہو رہی ہے لیکن وہ اس بات کو محسوس کر لیتی ہے۔ خلفیہ المہدی کی میت پر آہ و بکا کرتے ہوئے اسے مخاطب کر کے اس کی چہیتی کنیز نے فریاد کی تھی کہ اس نے جو زہر کھانے میں ملایا تھا وہ خلیفہ کے لیے نہیں اپنی رقیب کے لیے تھا۔ اس نے بین کرتے ہوئے کہا تھا ''میرے آقا میں آپ کو صرف اپنا دیکھنا چاہتی تھی۔'' (3)

حسد کا عنصر جو میرے خیال میں نہایت اہم ہوتا ہے' جب میں نے اس کے بارے میں ہانس سے سوال کیا تو مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف پنزر کے نقطۂ نظر سے اتفاق رکھتا ہے بلکہ اس نے میری رائے کے بارے میں بھی شبہے کا اظہار کیا۔

''ہوسکتا ہے تمہارے خلیفہ کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو' ہوسکتا ہے وہ خلل دماغ کے عارضے میں مبتلا ہو'' اس نے مسکرا کر اپنی مٹھیاں بند کیں اور انہیں یوں لہرایا جیسے وہ کسی خیالی باکسنگ ایریا میں کھڑا ہو'' فاطمہ! اب جبکہ ہم اپنی اپنی تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے مردوں کی نفسی کیفیات کا سائنسی بنیادوں پر جائزہ لے رہے ہیں' اور ان کے درمیان ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے نکتے تلاش کر رہے ہیں' ہمیں اس بات کو بھی نظر میں رکھنا ہوگا کہ ہوسکتا ہے مغربی مرد' مسلمان

مردوں کی نسبت عورتوں سے کم خوف محسوس کرتے
ہیں۔''

میں نے ہانس سے درخواست کی کہ وہ میرے خلفا پر حملے نہ کرے اور نہ استہزا سے کام لے۔ کیونکہ بات حرم کی ہورہی ہو یا کسی اور معاملے کی' سنجیدہ گفتگو سے بچ کر نکلنے کے لیے ہر جگہ کے مردوں کا یہی وطیرہ ہے۔ اس نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری بات سے اتفاق کیا۔ اور مجھے یہ بات یاد دلائی کہ ''حرم تفتیش'' کے معاملے کو وہ بہت سنجیدگی سے لے رہا ہے۔ اور اس نے نہایت مقبول بیلے ''شہرزاد'' کو دیکھنے کے لیے اپنا اور میرا نام منتظرین کی فہرست میں لکھوا دیا ہے۔ اس بیلے کی کوریوگرافی بنیادی طور پر سرگئی ویاغیلو نے کی تھی۔ ہانس نے مجھ سے کہا کہ اس دوران مجھے تھوڑی سی ابتدائی معلومات حاصل کر لینی چاہئیں۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ کیوں نا میں ان الفاظ کی ایک فہرست بنالوں جو ترک اور عرب حرم کی عورتوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مجھے اس کا یہ مشورہ اچھا لگا اور میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں حرم سے متعلق اصطلاحات کی تشریح کا جائزہ لے لوں گی تا کہ کم سے کم اصطلاحات کی سطح پر ہم ایک دوسرے کی تہذیب میں پائے جانے والے اختلافات کے بارے میں جان سکیں۔ میں نے سوچا کہ برلن کی ایک دوسری کتاب کی دکان Arabisches Buch میں سکون سے بیٹھ کر چند لغتوں کی ورق گردانی کرلوں گی' اسی لیے میں نے بہت اعتماد کے ساتھ وعدہ کرلیا کہ بیلے دیکھنے سے پہلے میں ان تشریحات کو نظر سے گذار لوں گی۔

ہم Savigny Platz سے نکلنے ہی والے تھے کہ ہانس کو کچھ یاد آ گیا۔ اور وہ اسٹور کے عقبی حصے کی طرف لپکا' اس نے ''معلومات'' کی میز پر بیٹھے ہوئے نوجوان سے کچھ گفتگو کی اور پھر کتابوں کی الماریوں کو دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک چکنے سرورق والی کتاب کو فتح مندی سے لہراتا ہوا میری طرف آیا۔ اس کتاب کا گرد پوش گہرا نیلا تھا اور اس پر بھاری کولہوں اور میڈوسا جیسے بھنورا سیاہ بالوں والی برہنہ عورت نیم دراز تھی۔ اس کے چھلکتے ہوئے سینے پر اس

کی سیاہ زلفیں خم درخم پھیلی ہوئی تھیں۔اس پر چھپے ہوئے
دوجرمن لفظ"Arabischen Nachten" تو میری سمجھ میں آ گئے(4) لیکن میں یہ سمجھ نہ سکی
کہ "Geschlechter Lust und List in den Arabischen Nachten"
کے کیا معنی تھے؟ میں نے اتنی دھیمی آواز میں کہ کوئی سن نہ سکے ہانس سے اس جملے کا مطلب پوچھا۔اس نے فوراً ہی بتایا کہ اس کا مطلب ہے''الف لیلہ میں جنسی خواہش اور شہوت'' یہ کتاب شہرزاد کی کہانیوں کا ایک حالیہ ایڈیشن تھی'1985ء میں شائع ہوئی تھی۔اور مشرقی جرمنی کے ایک آرٹسٹ نے اسے مصور کیا تھا۔لیکن اس نے مسلمان داستان گو کی جس طرح ترجمانی کی تھی وہ میرے لیے یکسر نامانوس تھی۔

میرے ذہن میں فربہی مائل برہنہ شہرزاد کا تصور کبھی نہیں ابھرا تھا۔عرب دنیا میں موسم معتدل ہوتا ہے اس کے باوجود پاگل خانے میں رہنے والی اور خلل دماغ میں مبتلا عورتیں ہی لباس ترک کرسکتی ہیں اور جہاں تک فربہی کا سوال ہے تو میرے خیال میں اس کا تعلق بہت زیادہ آسودگی سے بنتا ہے۔ میں خود جب خوش اور مطمئن ہوتی ہوں میرا وزن بڑھ جاتا ہے اور جب الجھنوں میں مبتلا ہوں تو وزن میں کمی ہوجاتی ہے۔ میری نسل جو ٹیلی ویژن کے دور سے پہلے داستان گوئی کی روایت کے ساتھ بڑی ہوئی' ان داستانوں کی ہیروئنیں صرف اسی وقت کمزور نظر آتی تھیں جب وہ مشکلوں میں گرفتار ہوں۔عورت کے فربہ ہونے کا مطلب ہے کہ اس کی تقدیر اس کی اپنی مٹھی میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میرے خیال میں شہرزاد نازک اندام ہوگی۔ میں جب بھی اس کا تصور کرتی ہوں تناؤ میں مبتلا اس عورت کی تصویر ابھرتی ہے جس کا شوہر تند اور وحشی مزاج ہے اور جسے ہر وقت اپنی جان کا خطرہ ہے۔ کتاب کو الماری میں رکھنے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ شہرزاد کے سیاسی پیغام کی اس میں کہاں جھلک ہے؟ شاید اس آرٹسٹ کو''الف لیلہ ولیلہ'' کی کوئی ناقص یا پھٹی ہوئی جلد ملی ہو۔ میں نے جب ہانس سے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا تو وہ جمہوریت اور

تکثریت پر میرے سامنے تقریر کرنے لگا۔

اس نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ "جرمن آرٹسٹ کے پاس بھی کتاب کا وہی نسخہ ہو جو تمہارے پاس ہے لیکن اس نے کتاب سے مختلف پیغام اخذ کیا ہو۔ آزادئ افکار اور اس کے اظہار کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ایک مرتبہ پھر ہانس نے مجھ سے زیادہ ذہن جدید اور جمہوری ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شہرزاد اپنی قبر میں کروٹیں بدل رہی ہوگی اور مجھے برا بھلا کہہ رہی ہوگی کہ میں مردوں کے مقابلے میں ذہنی پھرتیلے پن اور حس مزاح کا ثبوت نہیں دیتی اور میری کارکردگی نسبتاً خراب ہے۔ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب میری خود توقیری کم ہونے لگتی ہے اور تب میں اپنی صوفی روایات کا سہارا لیتی ہوں اور خود کو یہ بات یاد دلاتی ہوں کہ جب آپ غیر ملکیوں سے کچھ سیکھ رہے ہوں تو آپ کو کئی مرتبہ فروتنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ منکسر المزاج ہونا واقعی کتنا مشکل ہے لیکن اس روز مجھے اپنے اپ کو زیادہ برا بھلا نہیں کہنا پڑا کیونکہ ہانس نے خاص مغربی انداز میں اپنی گھڑی دیکھی اور اچانک اعلان کر دیا کہ اسے تو فوراً جانا ہے۔ مجھے یہ بات بہت ناپسند ہے کہ عین اس وقت جب میں ان سے کسی قسم کے اہم فلسفیانہ انکشاف پر تبادلہ خیال کرتی ہوں تو وہ اپنی گھڑی دیکھنے لگتے ہیں اور ایسا وہ ہمیشہ کرتے ہیں جس سے ان کے اپنے وقت کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے اور میرے وقت کی قدر و قیمت میں کمی۔ میں ہمیشہ آپ سے کہتی ہوں کہ اگلی مرتبہ میں انہیں کسی جملے کے درمیان اچانک ان کی بات کاٹ کر اپنی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اپنی اہمیت جتاتے ہوئے یہ کہوں کہ مجھے خود کہیں پہنچنا ہے۔ لیکن میں یہ بات کبھی بھی بروقت نہیں کہہ پاتی۔ میں نے صوفی وراثت کی طرف پلٹتے ہوئے خود سے کہا کہ چلو کوئی بات نہیں، اگر تم کچھ سیکھ رہی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی تمہاری اہمیت نہ سمجھے۔

اور یہی ہوا کہ میں نے ساری سہ پہر لگا کر ہانس کو مرعوب کرنے کے لیے نہایت محنت سے حرم سے متعلق جن لفظوں کی تشریح لکھی تھی، ان پر سرسری نظر بھی نہ ڈالی جا سکی۔ ہم جب اس

تھیٹر کے سامنے ملے جہاں بیلے ''شہرزاد'' دکھایا جا رہا تھا

تو ہمیں ایک لمبی قطار میں کھڑا ہونا پڑا اور مجھے اندازہ ہوا کہ رباط کی طرح برلن میں قطار کے اندر کھڑے ہونے والے بات چیت نہیں کرتے۔ یہاں خاموش رہنے کو مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ سردی سے میرے دانت بج رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے اپنی تحقیق کو نہایت اختصار سے بیان کر ہی دیا تاکہ ہانس کے خیالات سمجھ سکوں اور اس کے تاثرات کا جائزہ لے سکوں، لیکن افسوس کہ ہم روبرو نہیں تھے کہ میں اس کے چہرے کو بغور دیکھ سکوں۔ ہم ایک دوسرے کے برابر کھڑے تھے لیکن مجھے تو اپنی بات کرنی تھی۔ چنانچہ میں نے ہمت کر کے اپنی بات لفظ ''کنیز'' سے شروع کی۔

"Odalisque" یا ''کنیز'' ایک ایسا لفظ ہے جو مغرب میں عمومی طور پر حرم میں پائی جانے والی غلام عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے اور یہ "Oda" یعنی کمرہ سے نکلا ہے اور اپنا ایک مخصوص مفہوم رکھتا ہے۔ ایک ترک ادیب Alev Lytle Crontier جس کی پیدائش ایک ایسے گھر میں ہوئی تھی جو پہلے ایک پاشا کا حرم تھا، کے مطابق "Odalisque" کے لفظی معنی ''کمرے کی عورت'' ہیں اور یہ لفظ ملازمہ کے منصب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔(5) عرب لفظ ''جریہ'' کے معنی بھی ملازمہ کے ہیں جو حرم سے متعلق کنیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے لیکن لسانی اعتبار سے ان کے درمیان بہت اہم فرق ہے۔ "Odalisque" کا تعلق مکان سے ہے۔ جبکہ ''جریہ'' حرکت سے تعلق رکھتی ہے ''جریہ'' کا مطلب ہے ''خادمہ'' یعنی بھاگ دوڑ کرنے والی۔ جریہ ایک ایسا فرد ہے جو خدمت پر مامور ہے۔ وہ اپنے آقا کی خواہشات کی تکمیل دوڑ دوڑ کر کرتی ہے۔(6) جب میرے منہ سے ''آقا کی خواہش'' نکلا تو ہانس نے فوراً میری بات پر صاد کیا اور فاتحانہ انداز میں کہا کہ اب وہ ''کنیز'' کی بجائے ''جریہ'' کے لفظ کو ترجیح دے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہ تشہیری مہم چلا کر خوشی محسوس کرے گا کہ یورپی افراد کو ترکی لفظ کی بجائے عربی لفظ کو ترجیح دینی چاہیے۔

عورت غلاموں کے لیے ترکی لفظ استعمال کیا
جائے یا عربی لفظ ''جریہ'' یہ عورتیں غلام بازار سے خریدی جاتی تھیں۔ یا لڑائیوں اور جنگوں کے دوران مالِ غنیمت کے طور پر ہاتھ آتی تھیں۔ اپنی تعلیم و تربیت اور مختلف فنون میں مہارت ہی صرف وہ طریقے تھے جن کے ذریعے حرم کے آقا کی نظر میں آنا ممکن ہوتا تھا۔

Alev Lytle Croutier نے لکھا ہے کہ ''وہ کنیزیں جو غیر معمولی طور پر حسین اور مختلف فنون سے بہرور ہوتی تھیں، انہیں داشتہ ہونے کی تربیت دی جاتی تھی ان کے لیے رقص، شاعری اور آلات موسیقی کو بجانے میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ شہوانی فن میں بھی طاق ہونا لازمی تھا''۔(7) میں نے ہانس سے کہا کہ اس طرح دیکھا جائے تو ترک کنیزوں اور جاپانی گیشاؤں میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے کیونکہ ایک ماہر کے مطابق ''گیشا وہ لڑکیاں یا عورتیں ہوتی ہیں جو رقص اور گانے میں مہارت رکھتی ہوں'' (8) میں نے اپنی مختصر تقریر نویں صدی کے عرب مصنف جاحظ کی بات پر ختم کی۔ اس نے اپنے کئی مضامین میں جریہ کے بارے میں ان پریشان کن اور خطرناک خیالات کا اظہار کیا ہے کہ یہ بالکل غیر منطقی بات ہے اگر یہ فرض کیا جائے کہ ایک ذہین اور باکمال عورت اپنی صلاحیتوں اور اپنے فن کو اپنے آقا پر حکمرانی کرنے کے لیے استعمال نہیں کرے گی۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ ایک ماہرِ فن جریہ مرد کے سینے میں جس نوعیت کا عشق بیدار کرسکتی ہے'' وہ ایک طاعون کی طرح ہے مرد پوری طرح جس کی زد میں ہوتے ہیں۔'' پھر جاحظ اپنے اس جملے کی تشریح یوں کرتا ہے کہ ایک جریہ مردوں کو ایک پیچیدہ جذباتی اور ریشمی جال میں پھنسا لیتی ہے جس کی بُنت مختلف سطح پر نوع بہ نوع جذبات سے کی جاتی ہے۔ جاحظ کہتا ہے کہ ''یہ عشق محیط ہوتا ہے اور مختلف نوعیت کے اثرات کی پرورش کرتا ہے۔ یہ محبت، شہوانی جذبات اور لگاؤ کو ایک دوسرے سے اس طرح منسلک کرتا ہے کہ اس تعلق اور دوسراہٹ کو جاری رکھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔'' (9)

میری تقریر کے اس اہم مرحلے میں جبکہ میں یہ سمجھ رہی تھی کہ اب میں مغربی مرد کی نفسیات

کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کرسکوں گی' وہ طویل قطار جس میں ہم کھڑے تھے اچانک غائب ہوگئی اور ہم نے خود کو اوپیرا ہاؤس کے اندر پایا جہاں اس وقت سب سے اہم مرحلہ یہ تھا کہ ہم اپنی نشست تک کیسے پہنچیں جبکہ سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ آخر کار جب ہم اپنی نشستوں پر براجمان ہوگئے۔ تو ہانس نے میرے محبوب ترین مصنفین میں سے ایک یعنی جاحظ کے ذکر کو استہزائیہ انداز میں اڑا دیا۔

ہانس کے منہ سے یہ جملہ سن کر میں حیران رہ گئی کہ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا ''فاطمہ تمہارے جاحظ کی کیا عمر تھی جب اس نے یہ لکھا؟ اس کا تصور محبت کسی نوجوان کا سا ہے جو بلوغت کی طرف بڑھ رہا ہو۔ وہ بہت سی باتوں کی توقع رکھتا ہے۔ محبت' شہوانی جذبات' لگاؤ' وغیرہ وغیرہ۔ کیا تم نے رومانوی ادیبوں کے بارے میں سنا ہے اور اب ہمیں خاموش ہونا پڑے گا۔'' لیجیے' بات ہی تمام ہوگئی۔ ہانس نے میرے محبوب مصنف جاحظ کا تیاپانچا کردیا تھا اور مجھے خاموش ہوجانا پڑا کیونکہ رباط کے محمد پنجم تھیٹر کی طرح جہاں ہم پردہ اٹھنے کے بعد بھی اپنی بات جاری رکھ سکتے ہیں لیکن یہاں برلن میں اگر ہم مکمل سکوت کے ساتھ اپنی توجہ اسٹیج پر مرکوز نہ کرتے تو ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا۔

لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے اپنے خاموش رہنے پر خوشی ہوئی کیونکہ اس ناقابل فراموش بیلے کو دیکھنے اور اس پر ہونے والی خیال انگیز بحث کے بعد ہی مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا اشارہ ملا کہ مغربی حرم میں عورت کا خوف نہیں پایا جاتا۔ مجھے اس بات پر حیرانی ہوئی کہ بیلے ''شہرزاد'' میں ایک عورت کا سب سے زیادہ شہوت انگیز ہتھیار ''نطق'' موجود نہیں تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ لفظوں کو سوچنا اور احتیاط سے چنی ہوئی اصطلاحات سے مرد کے ذہن کو فتح کرنا۔ مشرق کی شہرزاد جرمن بیلے کی شہرزاد کی طرح رقص نہیں کرتی۔ اس کی بجائے وہ سوچتی ہے اور لفظوں کو اپنی کہانیوں میں پروتی ہے تاکہ اپنے شوہر کو اپنے قتل سے باز رکھ سکے۔

شہرزاد پر جو کتاب میں نے جرمن میں دیکھی تھی وہ اس کے بدن پر زور دیتی ہے جبکہ

مشرق کی شہرزاد خالصتاً ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ اور یہی
اس کی جنسی کشش کی اصل ہے۔ اصل کہانیوں میں شہرزاد کے بدن کا تو شاید ہی کہیں ذکر ہوا ہے لیکن اس کے علم و فضل پر بار بار اصرار کیا جاتا ہے، رات بھیگتی ہے تو ہم اسے لفظوں سے کھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں، یہی وہ رقص ہے جو شہرزاد کرتی ہے اور ایک ایسے انداز میں جسے ''سمر'' کہا جاتا ہے۔

''سمر'' عربی کا ایک ایسا لفظ ہے جس کے لغوی معنی 'راتوں کو باتیں کرنا'' ہے لیکن یہ لفظ کئی دوسرے عربی الفاظ کی طرح جمالیاتی تسکین کے کئی مفاہیم رکھتا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ رات کے اندھیرے میں مدہم لہجے میں بات کرنا جو ناقابل یقین حد تک محسوسات کے اور بہت سے پہلو آشکار کرتا ہے۔ ''سمر'' یعنی قصہ گوئی' داستان سرائی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچتی ہے جب چاندنی چٹکی ہوئی ہو۔ جسے عربی میں ''ظل القمر'' بھی کہتے ہیں اور یہ بھی ''سمر'' کا ایک مفہوم ہے۔ چاندنی میں نہائے ہوئے عشاق اپنے کائناتی ماخذ میں تحلیل ہوجاتے ہیں اور پرُنور آسمان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ وہ مکالمہ جو ایک عورت اور مرد کے درمیان دن کے اجالے میں مشکل محسوس ہوتا ہے' وہ چاندنی کے غبار میں ممکن ہوجاتا ہے۔ دن کے متضاد معاملات جب معدوم ہوجاتے ہیں تو دونوں صنفوں کے درمیان اعتماد کے رشتے کے پھلنے پھولنے کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔ مشرق کی شہرزاد ''سمر'' اور اس سے پھوٹنے والی بہ ظاہر سیال لیکن درحقیقت شدید امیدوں کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ رات کے سناٹے میں مکالمے کے لیے اس کی نرم پکار اتنی سحرناک ہے کہ ہم اس کے بدن کی طرف مشکل سے ہی متوجہ ہوتے ہیں۔

مجھے جب یہ بات یاد آئی تو میں اس بارے میں سوچتی رہی کہ جس تہذیب میں حسین عورتوں کو ذہنی صلاحیت سے محروم رکھا جاتا ہو وہاں ہیجانی شہوت کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اگر عورت کا ذہن ہی موجود نہیں تو پھر مغربی لوگ جسمانی برانگیختگی کے اظہار کے لیے کون سا لفظ استعمال کرتے ہیں؟ اختلاط دو افراد کے درمیان ربط اور ارتباط کا نام ہے۔ جنسی اختلاط

کے درمیان سمجھوتے ''یا گفت وشنید'' کا مطلب ایک
دوسرے کی توقعات اور ضروریات کے درمیان ہم آہنگی ہے جو صرف اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب دونوں شریک اپنے ذہن کو استعمال کریں۔ شہرزادا اگر زندہ رہی تو اس لیے کہ وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا شوہر اختلاط کو لذت کی بجائے اذیت سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے اس ذہنی رجحان کو بدلنے کے لیے شہرزاد کو اس کے ذہن پر کام کرنا تھا۔ اگر وہ اس کے سامنے رقص کرتی تو وہ اسے بھی قتل کرادیتا جس طرح وہ دوسری عورتوں کو قتل کراتا آیا تھا۔

میں نے جب Random House ڈکشنری میں Orgasm کے معنی دیکھے تو مجھے معلوم ہوا کہ اس لفظ کا انگریزی مفہوم عربی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ لغت میں سب سے پہلے یہ لکھا ہوا تھا کہ اس لفظ کا مطلب یہ ہے جنسی عمل کے اختتام پر جسمانی اور جذباتی سنسنی خیزی کا احساس۔ اس لفظ کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس سنسنی خیزی کو محسوس کرنے کا واقعہ اور تیسرا مفہوم یہ تھا کہ'' ایک نہایت شدید اور بے روک ٹوک جوش'' Orgasm اور Excitement دونوں ہی یونانی الاصل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پھیلنا اور انسان کی عمومی حدوں سے زیادہ پھیلنا۔ لغت میں لکھا تھا کہ (Orgasm(us' یونانی لفظ Orgasmos سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ہیجان ہے۔ (Orga(cein کا مطلب پھیلنا اور ہیجان میں مبتلا ہونا ہے۔ جنسی لذت کے لیے کم از کم ایک عربی لفظ بالکل یہی مفہوم رکھتا ہے۔ چودھویں صدی کی اپنی لغت میں ابن منظور لکھتا ہے کہ ''اغتلام'' کا مطلب حدوں سے باہر جانا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سمندر جب بپھرتا ہے تو اس کی لہریں ایک مضطرب انداز میں اپنا سر پٹکتی ہیں۔ (کالبحر ہیج وضطرابت امواجہ)

حصول لذت کے لیے دو افراد کا ایک دوسرے سے مکالمہ لازمی ہے' اور اس مہم کو ایک ساتھ سر کرنا کہ وہ اپنی حدوں سے اس مخصوص لمحے پر باہر نکل جائیں جب ان کے بدن کا آہنگ بے ترتیب ہوگیا ہو۔

تو پھر ایسا کیوں ہے کہ شہرزاد جو مکالمے اور گفتگو

میں مہارت تامہ رکھتی ہے، وہ جب مغرب کا رخ کرتی ہے تو اپنے آسمانجہت اور اپنی موہوم خوبیوں سے محروم کیوں ہو جاتی ہے؟

جرمن آرٹسٹ کی بنائی ہوئی فربہی مائل برہنہ عورت کی تصویر، جرمن بیلے میں رقص کرتی ہوئی شہرزاد اور مغربی مردوں کے مغربی ذہنوں میں آباد حرم کے اندر ان کی حیران کر دینے والی بے خطر کیفیت، ان تینوں کے درمیان کیا کوئی رشتہ ہے۔؟

کیا مغربی مرد کشش کو محض بدن بولی بنا کر رکھ دیتے ہیں؟

کشش کو کیا شدید ارتباط اور مکالمہ سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے؟

مغربی مصوروں کی تخلیق کی ہوئی شہرزاد کون ہے؟

مغربی مرد اسے وہ کون سے ہتھیار فراہم کرتے ہیں جن سے وہ انہیں رام کر سکے؟

لیکن اس سے پہلے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ مغرب کی شہرزاد کون ہے، ہمیں حقیقی اور اصلی شہرزاد کے بارے میں چند باتیں معلوم کرنی پڑیں گی۔ ہم تب ہی ان داستانوں کے درمیان تقابل کر سکیں گے اور دونوں تہذیبوں سے بھی کچھ سیکھ سکیں گے۔

(4)

ذہن ایک شہوانی ہتھیار

شہرزاد اس نوجوان دلہن کا ایرانی نام ہے جو الف لیلہ ولیلہ کی کہانیاں کہتی ہے۔ یہ تمام کہانیاں ''نسلی اعتبار سے ہندوستانی' ایرانی اور عربی ماخذ رکھتی ہیں'' (1) یہ داستانیں اسلام کی مذہبی اور تہذیبی تکثیریت پر مبنی خلاقی کا مظہر ہیں اور ان داستانوں کا جغرافیہ ایک ایسا علاقہ ہے جو مالی سے مراکش اور اوقیانوس کے ساحلوں سے شمالی افریقہ اور ہندوستان' منگولیا اور چین تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم جب ان داستانوں کی شناوری شروع کرتے ہیں تو ہم ایک ایسی مسلم کائنات میں قدم رکھتے ہیں جو ان عمومی سرحدوں کو نظر انداز کر دیتی ہے جو دور دراز کے علاقوں اور مختلف النوع تہذیبوں کو ایک وسرے سے جدا کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان داستانوں میں ایرانی النسل افراد عربی بولتے ہیں اور ان قوموں کی رہنمائی کرنے والوں کے طور پر ابھرتے ہیں جن سے ان کا تہذیبی ورثہ مختلف ہے۔ ''شہرزاد'' فارسی کے لفظ ''چہر'' کا عربی تلفظ ہے جس کا مطلب پیدا ہونا ہے اور ''زاد'' کے معنی ''اعلیٰ نسب ہونا'' یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجئے کہ اشرافیہ سے ہونا ہے۔ اس کے شوہر کا نام شہر یار ہے۔ یہ نام بھی فارسی الاصل ہے اور فارسی کے الفاظ ''شہر'' اور ''دار'' سے لیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے ''سلطنت کا مالک'' (2) لیکن اپنی خوابگاہ میں شہر زاد اپنے شوہر شہر یار کو جو شاہانِ ساسان کی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک مغرور فرد ہے (3) یہ

داستانیں فارسی میں نہیں عربی میں سناتی ہے اور حالانکہ
شہر یار ایرانی النسل ہے لیکن'' جرائز ہندوستان اور ہند چینی پر حکومت کرتا ہے'' (4) تاہم یہ داستانیں جو ایک عالمی شان اور دلکشی رکھتی ہیں اور ثقافتی سرحدوں سے ماورا ہونے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی ہیں' وہ دونوں صنفوں کے درمیان تعلق کا دائرہ وسیع نہیں کرتیں۔ ان داستانوں میں مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک عمیق اور ناقابل عبور سرحد ہے۔ ایک خونیں جنگ برپا ہے۔

''الف لیلہ ولیلہ'' بے وفائی اور انتقام کی ایک الم ناک داستان کے انداز میں شروع ہوتی ہے اور اس کا اختتام پریوں کی کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں شہرزاد کی دانشورانہ صلاحیتوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جو اپنے شوہر کے ذہن کو پڑھنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ شہریار کا چھوٹا بھائی شاہ زمان' سرزمین سمرقند پر شاداں وفرحاں حکومت کر رہا ہے۔ ایک روزہ وہ اپنے محل میں واپس آتا ہے تو اپنی بیوی کو'' ایک باورچی'' (5) کی بانہوں میں پاتا ہے۔ وہ ان دونوں کو قتل کرتا ہے۔ اور کچھ عرصے کے لیے اپنی سلطنت کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسے امید ہے کہ اس دوران اس کے زخم بھر جائیں گے۔ وہ اپنے بڑے بھائی شہریار کی سلطنت کا رخ کرتا ہے۔

جرم کی جائے وقوع سے فرار کا نسخہ صرف چند دنوں کے لیے اس کے کام آتا ہے۔ ایک صبح اداس اور پژمردہ شاہ زمان کی نظر ایک دریچے سے اپنے بھائی کے حرم کے باغ کی طرف اٹھتی ہے تو اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ فریب نظر میں مبتلا ہے۔

وہ اپنی بدبختی کے کرب میں گرفتار ہے اور آسمان کو تک رہا ہے کہ اس کی پریشان نظر باغ کی طرف اٹھتی ہے۔ اس کے بھائی کے محل کا اندرونی دروازہ کھلتا ہے اور اس میں سے وہ غزال چشم حسینہ نکلتی ہے جو اس کے بھائی کی بیگم ہے۔ اس کے ساتھ دس سفید اور دس سیاہ فام کنیزیں ہیں...... وہ سب بیٹھ جاتی ہیں اور اپنے لباس اتار دیتی ہیں اور تب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے

دس غلام تھے جو کنیزوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھے وہ دس

سیاہ فام غلام دس کنیزوں سے محو اختلاط ہو جاتے ہیں۔ اسی وقت بیگم ''مسعود۔ مسعود'' کی آواز لگاتی ہے۔ ایک پیڑ سے ایک حبشی غلام کودتا ہے اور لپک کر بادشاہ بیگم سے بغل گیر ہو جاتا ہے۔ اختلاط کا یہ سلسلہ دوپہر تک چلتا ہے جس کے بعد وہ دس غلام پھر سے کنیزوں جیسا لباس پہن لیتے ہیں اور وہاں بیس کنیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ مسعود باغ کی دیوار پھاند کر غائب ہو جاتا ہے جبکہ کنیزیں اور بادشاہ بیگم چہل قدمی کرتی ہوئی باغ کے اندرونی دروازے تک جاتی ہیں اور اسے مقفل کر کے اپنی راہ لیتی ہیں۔(6)

یہاں بادشاہ بیگم کی اپنے شوہر شہریار سے جنسی بے وفائی دراصل غلام کی اپنے آقا سے سیاسی غداری کو ظاہر کرتی اور اس کی عکاسی کرتی ہے۔ عربی کا وہ جملہ جس میں ''بادشاہ بیگم سے مسعود کا اختلاط'' (7) دراصل حرم کے اصل المیے کو بیان کرتا ہے۔ شوہر جس نے نظام مراتب کے تحت بیوی کو حرم میں مقفل کر رکھا ہے اسے تہس نہس کر دینے کی ہلاکت خیز ضرورت بیوی کو راستے سے ہٹنے اور بادشاہ کے غلام کے ساتھ اختلاط پر آمادہ کرتی ہے۔ شوہر سے بیوی کی بے وفائی حرم کی اپنی ساخت اور نظام میں موجود ہے۔ یہ وہ نظام ہائے مراتب اور سرحدیں ہیں جو مرد، عورتوں پر اپنا اختیار قائم رکھنے کے لیے متعین کرتے ہیں اور یہی وہ معاملات ہیں جو عورتوں کے رویوں کا تعین کرتے ہیں۔ الف لیلہ ولیلہ میں حرام کاری کے جرم کا منظر یہ دکھاتا ہے کہ حرم کی سرحدیں سرایت پذیر اور نازک ہیں، وہ دھندلائی اور مٹائی جاسکتی ہیں۔ مرد عورتوں کا لباس پہن کر اندر داخل ہو سکتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ بھی نہیں دیتا۔

آیئے ہم پھر شہرزاد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ باغ کے اس واقعے کے برسوں بعد وہ شہریار کے محل میں پہنچی لیکن اس وقت تک شہریار نہ صرف اپنی بیگم اور اپنے غلام مسعود کا سر اڑا چکا تھا بلکہ وہ سینکڑوں بے گناہ کنواریوں سے شادی کر کے پو پھٹنے سے پہلے انہیں قتل کرا چکا تھا۔'' اس نے یہی سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ تمام کنواریاں نیست و نابود ہو گئیں۔ ان کی ماؤں نے

ان کا غم منایا اور باپوں اور ماؤں کی آہ وبکا شروع ہوگئی۔''

(8) یہاں ہم پھر الف لیلہ ولیلہ میں جنس اور سیاست کو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دیکھتے ہیں۔ وہ معاملہ جو دونوں صنفوں کے درمیان جنگ کی صورت شروع ہوا تھا وہ ایک المناک سیاسی رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ بیٹیوں سے محروم ہوجانے والے باپ' بادشاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں اب صرف ایک مراعات یافتہ باپ بچا ہے جو بادشاہ کا وزیر ہے اور ایک رات کی دلہنوں کے قتل کی نگرانی کرتا رہا ہے۔ اس کی دو کنواری بیٹیاں شہرزاد اور دُنیازاد ابھی تک بچی ہوئی ہیں۔

وزیر دیوانہ وار اپنی بیٹیوں کے فرار کے منصوبے بنا رہا ہے۔ ایسے میں شہرزاد کا اصرار ہے کہ وہ اپنے آپ کو قربان کردے گی اور بادشاہ کا سامنا کرے گی۔ اسے امید ہے کہ وہ اس قتال کو روک سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ شہرزاد کو ایک سیاسی ہیرو کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ مسلمان دنیا میں آزاد کرانے والے ایک فرد کے رنگ میں۔ وہ اپنے پریشان حال باپ سے کہتی ہے'' پدر بزرگوار میری خواہش ہے کہ آپ بادشاہ شہریار سے میری شادی کرادیں تاکہ میں اپنے لوگوں کو بچانے میں کامیاب ہوسکوں یا دوسروں کی طرح میں بھی ختم ہوجاؤں'' (9) اس کے ذہن میں ایک ترکیب ہے جو آخر کار کامیابی سے ہم کنار ہوگی۔ وہ بادشاہ کو مسحور کردینے والی کہانیوں کے سحر میں مبتلا کردے گی۔ وہ انہیں مزید سننے کے لیے بے تاب ہوجائے گا اور یوں اپنی جان بچالے گی۔

کہانیاں سنا کر ایک ایسے جرائم پیشہ شخص کے ذہن کو بدل دینا جو آپ کے قتل پر تلا ہوا ہے ایک غیر معمولی کارنامہ ہے' اپنی کامیابی کے لیے شہرزاد کی حکمت عملی خود کو تین ہنرمندیوں سے آراستہ کرنا ہے۔ ان میں معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ' مجرم کے ذہن کو واضح طور پر سمجھنے کی صلاحیت اور ٹھنڈے مزاج کے ساتھ عمل کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔ پہلا ہنر یا پہلی صلاحیت دانشورانہ ہے۔ جس کے لیے معلومات کا ایک خزانہ درکار ہے اس حوالے سے شہرزاد کی

انسائیکلو پیڈیائی تجرِعلمی کا اندازہ داستان کے آغاز میں ہی
ان جملوں سے ہوجاتا ہے کہ ''شہرزاد نے ادب' فلسفے اور طب کی کتابیں پڑھی تھیں۔ شعراء کا کلام اسے ازبر تھا۔ متعدد تاریخی وقائع اس کی نظر سے گزر چکے تھے وہ داناؤں' درویشوں اور بادشاہوں کے اقوال سے آگاہ تھی۔ وہ ذہین' علم شناس' دانش منداور مہذب تھی اس نے کتابیں پڑھی تھیں اوران سے اخذ کیا تھا''(10) لیکن کسی عورت کوصرف ذی علم ہونا ہی اسے اس قابل نہیں بنادیتا کہ وہ بااقتدار مردوں پر اثر انداز ہوسکے۔ ہمارے سامنے ایسی بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتوں کی مثالیں ہیں جو آج مغرب میں سماجی تحریکوں سے وابستہ ہیں لیکن اس کے باوجود آج کے شہریاروں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ہیں۔ اس لیے شہرزاد کی بے پناہ کامیاب کہانی کے تجزیے کی ضرورت ہے۔

ہماری ہیروئن کا دوسرا وصف اور صلاحیت نفسیاتی پہلو رکھتا ہے اور وہ ہے صرف لفظوں سے کسی مجرم کے ذہن کو بدل دینے کی صلاحیت۔ کسی قاتل سے صرف مکالمے اور گفتگو کے ذریعے ہتھیار رکھوالینا ایک نہایت جرأتمندانہ حکمت عملی ہے۔ اس حکمت عملی میں کامیاب ہونے کے لیے لازم ہے کہ شکار اس جرائم پیشہ کے ہر ممکنہ داؤ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو' اور اس بات سے آگاہ ہو کہ وہ پیش آنے والے واقعات کو کس طرح جوڑ کر دیکھے۔ یوں جیسے شطرنج کے کھیل میں حریف کی امکانی چال نظر میں رکھی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بات یادرکھنی چاہیے کہ بادشاہ جو کہ جارح ہے وہ ابتدائی دنوں میں شہرزاد سے گفتگو نہیں کرتا۔ اس کی داستان سرائی کے ابتدائی چھ مہینوں میں وہ خاموش رہتا ہے اور اپنی زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر صرف سنتا رہتا ہے۔ شہرزاد کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ وہ بس اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتی ہے۔ اوراس کے بدن کی حرکات وسکنات پر نظر رکھ سکتی ہے۔ رات کے دوران وہ اپنی بات کو کس طرح جاری رکھے کہ اس سے نفسیاتی طور پر تخمینے یا اندازے کی کوئی مہلک بھول چوک نہ ہوجائے؟ فوجی حکمت عملی طے کرنے والے ماہر کی طرح جو اپنی معلومات کو مستقبل میں

پیش آنے والے واقعات کے لیے استعمال کرتا ہے۔اسی
کی طرح شہرزادکوصرف اندازہ اور بالکل درست اندازہ لگاناہے کیونکہ معمولی سے معمولی غلطی بھی مہلک ثابت ہوگی۔شہرزاد کا تیسرا اورآخری وصف اس کے ٹھنڈے مزاج کی وہ صلاحیت ہے جس سے وہ اپنے خوف پر اتنا قابو رکھتی ہے کہ واضح طور پر سوچ سکے اور جارح کے ساتھ اس متحرک اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے والے باہمی تعلق کی ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے نہ کہ اسے جارح کے سپرد کردے۔شہرزاد اگر بچ نکلتی ہے اور زندہ رہتی ہے تو صرف اس لیے کہ وہ دانش کے حوالے سے اعلیٰ ترین حکمت عملی تیار کرتی ہے۔اگر وہ ہالی ووڈ کی کسی ویمپ یا ماتمیں کی کنیز کی طرح بادشاہ کے بستر پر بے لباس ہوکر پڑ جاتی تو قتل کردی جاتی۔یہ شخص جنس کا طلب گارنہیں، اسے ایک نفسیاتی معالج کی تلاش ہے۔وہ اپنی ذات سے بدترین کراہت کے مرض میں مبتلا ہے۔اسی کیفیت میں وہ سب لوگ س وقت گرفتار ہوجاتے ہیں جب ان پر یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ وہ ایک بے وفا بیوی کے شوہر ہیں وہ اس لیے شدید طیش میں مبتلا ہے کہ صنف مخالف اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور یہ بات بھی کہ اس کی بیوی نے اس سے بے وفائی کیوں کی۔

اپنی ناطاقتی اور بے بضاعتی کے باوجود شہرزاد ایک گمبھیر اور پیچیدہ صورتحال کو بالکل درست طور پر سمجھ کر طاقت کا توازن بدل دیتی ہے اور بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ میری طرح کی بہت سی عورتیں جو سیاست کے بارے میں کچھ بھی نہیں سمجھ پاتیں آج بھی شہرزاد کی ستائش کرتی ہیں۔کچھ مغربی لوگ جو اس کہانی کو سمجھ نہیں پاتے اور شہرزاد محض ایک بیہودہ دل بہلانے والی کے طور پر دیکھتے ہیں۔وہ اسے جدید عورت کے لیے ایک برا نمونہ سمجھیں گے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اگر آپ اسے درست سیاسی تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو وہ ایک موزوں کرداری نمونے کے طور پر سامنے آتی ہے۔وہ نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ رفتہ رفتہ ساری سلطنت کو بچالیتی ہے کیونکہ وہ اس کے بارے میں فیصلے کرنے والے بادشاہ کے ذہن کو بدل دیتی ہے۔برطانوی

مصنف اے ایس بایٹ اپنے اس بیان میں باکل درست
ہے جب وہ یہ کہتی ہے کہ ''الف لیلہ کی کہانی شروع میں بہ ظاہر عورتوں کے خلاف محسوس ہوتی ہے کیونکہ شہرزاد اور اس کے شوہر کے درمیان قطعی غیر مساوی صورتحال ہے لیکن آخر تک پہنچتے پہنچتے وہ مکمل طور پر حاوی ہوجاتی ہے۔(11) آخرکار بادشاہ نہ صرف پوچھٹے اپنی دلہنوں کی گردنیں مارنے کے خوفناک عمل سے تائب ہونے کا اعلان کرتا ہے بلکہ شہرزاد کی خوش تدبیری اور جاذبیت بادشاہ کے اعتقادات' اس کے اغراض ومقاصد اور اس کی باطنی نفسی حالت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ عورتوں کے خلاف اس کا طیش غلط تھا۔'' اے شہرزاد تو نے مجھے اپنی بادشاہی کی صلاحیتوں کے بارے میں شک میں مبتلا کردیا۔ ماضی میں عورتوں کے خلاف میں نے جو تشدد کیا اور جس طرح نوجوان لڑکیوں کو ہلاک کیا اس پر مجھے ندامت ہے۔''(12)

یہ آخری جملہ جس میں ایک مطلق العنان بادشاہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اپنی بیوی سے اس کے مکالمے نے اس کا دنیاوی طرز فکر یکسر بدل دیا ہے۔ اسی آخری جملے کی بنیاد پر بیسویں صدی کے متعدد مشہور عرب لکھنے والے شہرزاد کو اور اس کے وسیلے سے تمام عورتوں کو یہ رتبہ اور منصب دیتے ہیں کہ وہ مہذب اور شائستہ بنانے والیاں ہیں۔ مصر کے بااثر مفکر اور دانشور طٰہٰ حسین نے یہ پیش گوئی کی کہ مردوں کو پرتشدد اعمال اور ارادوں سے نجات دلائی جاسکتی ہے اور امن پسندی اور سکون وطمانیت سے بدلا جاسکتا ہے اگر انہیں عورتوں کی محبت اور توجہ حاصل ہو۔ 1943ء میں ان کی کتاب ''شہرزاد کے خواب'' منظر عام پر آئی تو یہ داستان سرائی کرنے والی ان بہت سے بے گناہ اور معصوم انسانوں کے لیے ایک مثالیہ بن گئی جو مغرب کی برپا کی ہوئی دوسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں آگئے تھے اور جس جنگ نے ساری دنیا کو متاثر کر کے رکھ دیا تھا۔(13) طٰہٰ حسین کی اس کتاب کا بادشاہ' مردوں میں قتل وغارت کی المناک' لامحدود اور ناقابل فہم خواہش کی علامت ہے۔ اپنی قیدی کو برسوں سننے کے بعد شہریار پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شہرزاد ایک قیمتی راز کا مخزن ہے۔ اگر وہ اس کی اصلیت سے آگاہ ہوجائے اور یہ

جان لے کہ وہ کیا چاہتی ہے تو اس کی جذباتی نمو بھی ممکن
ہے اور اسے طمانیت بھی حاصل ہوسکتی ہے۔

شہریار: ''تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو؟''

شہرزاد: ''میں کون ہوں؟ میں وہی شہرزاد ہوں جس نے برسوں تمہیں نت نئی کہانیوں کی لذت سے آشنا کیا۔ حالانکہ میں تم سے بے پناہ خوفزدہ تھی لیکن میں اس منزل پر پہنچ گئی ہوں جہاں میں نے خود کو اس دہشت سے آزاد کر لیا ہے جس میں تم نے مجھے مبتلا کر رکھا تھا۔ اب میں تمہیں محبت دے سکتی ہوں رہی بات یہ کہ مجھے کیا چاہیے؟ میں چاہتی ہوں کہ میرا آقا' میرا بادشاہ سکون اور طمانیت کا ذائقہ چکھ سکے۔ تفکرات سے آزاد دنیا میں زندگی کرنے کی لذت سے آشنا ہو سکے۔''(14)

طہٰ حسین کی تحریر میں مکمل نجات اور آزادی اس وقت ملتی ہے جب بااختیار اور بے اختیار کے درمیان مکالمے کا آغاز ہوتا ہے۔ تہذیب اس وقت برگ وبار لائے گی جب مرد اپنی قریب ترین عورتوں سے یعنی اپنی شریک بستر عورتوں سے مکالمہ کرنا سیکھیں گے۔ طہٰ حسین جو نابینا تھے' معذور تھے' عورتوں کی طرح جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے' انہوں نے 1940ء کی دہائی میں قرون وسطیٰ کی شہرزاد کی داستانوں کی فطری علامتوں کو نئے سرے سے زندہ کیا اور انسانیت کا رشتہ نسائیت سے قائم کیا۔ آج مسلم دنیا میں مطلق العنان تشدد کو ختم کرنے کیلئے جدیدیت پر سوچ بچار لازمی طور سے نسائیت کے لیے ایک عرض داشت اور استدعا کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کہاں ہیں' انڈونیشیا' افغانستان' ترکی یا الجیریا میں' اگر آپ مسلم ٹیلی وژن اسٹیشنوں کے چینل بدلتے جائیں یا اخباروں اور رسالوں کی ورق گردانی کریں' آپ دیکھیں گے کہ جمہوریت پر ہونے والی بحث جلد ہی عورتوں کے حقوق کی بحث میں بدل جاتی ہے۔ پریشانیوں میں گرفتار آج کی اسلامی دنیا میں تکثریت اور نسائیت کے درمیان پراسرار تعلق کو شہر

زاد۔ شہر یار کی داستانوں میں خوفناک انداز میں اور شدت
کے ساتھ پیشگی طور پر بیان کر دیا گیا تھا۔

الف لیلہ ولیلہ میں شہر یار اس بات کا باضابطہ اعتراف کرتا ہے کہ ایک مرد کو اپنے تنازعات طے کرنے کے لیے تشدد کا سہارا لینے کی بجائے الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ شہرزاد اپنی صورتحال کو تبدیل کرنے کے لیے افواج نہیں رکھتی' لفظ اس کے مطیع ہیں۔ اس طرح یہ معاملہ ان داستانوں کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے اور یہ ہے تہذیب یافتہ کرنے کا ایک نیا اسطورہ۔ یہ تشدد پر تعقل کی فتح کی علامتیں ہیں۔

یہی سبب ہے کہ میں اسی نکتے پر اصرار کروں گی جو شہرزاد کے بارے میں مغربی آرٹسٹوں کے تصورات سے یکسر معدوم ہے۔ مشرق میں اگر صرف بدن کا استعمال کیا جائے اور اس میں ذہن کہیں شامل نہ ہو تو عورتوں کو اپنی حالت تبدیل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ بادشاہ کی پہلی بیوی اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہی کیونکہ اس کی بغاوت صرف بدن کی سیاست تک محدود تھی یعنی اپنے ایک غلام سے اختلاط کرنا۔ اپنے شوہر سے بے وفائی عورت کے لیے خودکشی کے عمل سے کم نہیں' جبکہ شہرزاد عورتوں کو یہ نکتہ تعلیم کرتی ہے کہ عورت اپنے ذہن کو صیقل کر لے تو اس کی بغاوت کامیاب رہتی ہے۔ علم ودانش کو حاصل کر کے اسے مردوں کی مدد کرنی چاہیے۔ تاکہ وہ ہم آہنگی کے لئے اپنی نرگیست زدہ ضرورت کو ترک کر دیں۔ وہ یہ سکھاتی ہے کہ اپنے سے مختلف صنف سے مجادلے میں جانے کی اور اس بات پر اصرار کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر مکالمے کو کامیاب بنانا ہے تو حدود کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جہاں لڑائی کا نتیجہ حتمی طور پر طے نہیں اور جہاں جیتنے اور ہارنے والے کا تعین پہلے سے نہیں ہو چکا وہاں مکالمے میں لوچ اور لچک سے لطف اندوز ہونے کا مطلب مختلف حالتوں کو خوشگوار بنانا ہے۔

آج کی مسلم دنیا کے نہایت ذہین دانشوروں میں سے ایک مراکشی مورخ عبدالسلام شدادی ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ الف لیلہ ولیلہ کا پہلا بنیادی پیغام یہ ہے کہ ''شہر یار پر یہ بات

آشکار ہوتی ہے اور وہ اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ کسی عورت سے بہ جبر اپنی طاقت منوانا ایک ناممکن بات ہے۔''(15) اس کے ساتھ ہی شدادی کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ بات خواہ کتنی ہی انقلابی ہو لیکن یہ ان داستانوں کے دوسرے پیغام سے کم تباہ کن اور تخریبی ہے جس کے مطابق اگر ہم اس بات کو مان لیں کہ شہر یار اور شہرزاد دن (روانگی: خارجی نظام یعنی قانون کی عملداری) اور رات (نسائیت: باطنی نظام یعنی خواہشوں کی عملداری) کے درمیان وسیع کائناتی آویزش کے نمائندہ ہیں تو یہ حقیقت مسلمان مردوں کو اس جنگ کے نتیجے کے بارے میں ناقابل بیان بے یقینی سے دوچار کر دیتی ہے کیونکہ بادشاہ نے اپنی ملکہ کو قتل نہیں کیا۔''شہرزاد کو زندہ رہنے کی اجازت دے کر بادشاہ نے اس قانون کو معطل کیا جو اس نے خود جاری کیا تھا''(16) شدادی کا کہنا ہے کہ''شہر یار ایک مرد ہے جو آپ اپنی نفی کرتا ہے۔شہرزاد کو زندہ رہنے، باتیں کرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دے کر وہ خود بے بس و بے اختیار ہو جاتا ہے۔''قانون اور خواہش ایک دوسرے کو متوازن کرتے ہیں اور بے یقینی یا امید و بیم کی ایک ایسی حالت میں گرفتار ہو جاتے ہیں جس میں حرکت کا نام نہیں لیکن اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں کہ ان میں سے کوئی ایک یا دوسرا کب متحرک ہو جائے گا۔'' (17) ان داستانوں کے اختتام پر مسلم دنیا میں سانس لینے والے مرد صرف ایک بارے میں پُر یقین ہو سکتے ہیں کہ دونوں اصناف کے درمیان جنگ اگر جذبات اور تعقل کے درمیان جنگ کی نمائندگی کرتی ہے تو اس کا کوئی خاتمہ نہیں۔

شدادی کے مطابق الف لیلہ ولیلہ میں داستان گو اور بادشاہ کے درمیان اختلاف اس بات کا بھی اظہار کرتی ہے اور اسے زیادہ نمایاں طور پر سامنے لاتی ہے کہ مسلم ثقافت میں شریعت جو کہ ایک مقدس سچ ہے اس کے اور فسانہ طرازی کے درمیان پھوٹ پڑنے والا تنازعہ پایا جاتا ہے۔شہرزاد کی فتح دراصل صدق کی حفاظت کرنے والوں کے جائز ہونے پر تخیل کی فتح ہے۔ وہ ان کی ساکھ کو تحلیل کر دیتی ہے(18) اس کے بعد شدادی نے قصہ خوانوں کی اداس کر دینے

والی تقدیر کو بیان کیا ہے اور یہ بتاتے ہیں کہ انہیں کس
طرح مسجدوں سے نکال دیا گیا کیونکہ ان کی فسانہ طرازی اور سچ کے درمیان امتیاز کرنا ایک
مشکل کام ہے۔ وہ سلمان رشدی کو ان قصہ خوانوں کا دور حاضر کا وارث قرار دیتے ہیں۔

قرون وسطیٰ کے بغداد میں سڑکوں پر پھرنے والے قصہ خواں یا داستان گو عموماً بغاوت کے
محرک کہے جاتے تھے اور جس طرح آج بائیں بازو کے صحافیوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اسی
طرح ان قصہ خوانوں کے ساتھ برتاؤ ہوتا تھا۔ ان پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں اور عام مقامات
پر ان کا بولنا ممکن نہیں تھا۔

طبری نے اپنی کتاب ''قوموں اور بادشاہوں کی تاریخ'' میں لکھا ہے کہ 279 ھجری
(دسویں صدی عیسوی) میں ''سلطان نے حکم دیا کہ بلدۂ امن (بغداد کا ایک نام) کے عوام کو آگاہ
کر دیا جائے کہ کسی بھی قصہ خوان کو اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ شہر کی گلیوں یا جامع مسجد
میں بیٹھ سکے۔''(19) شدادی نے یہ بات تفصیل سے بتائی ہے کہ سرکاری حکام نے قصہ
خوانوں کے خلاف باقاعدہ الزام تراشی شروع کر دی اور یہ کہا کہ یہ انتہائی خطرناک لوگ ہیں اور
محل کے پاس اس کے علاوہ چارہ نہیں کہ انہیں خاموش کر دیا جائے۔

'' بات وہاں سے شروع ہوتی ہے جب پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے
دوسرے حصے میں ہم چوتھے خلیفہ علی کو دیکھتے ہیں جنہوں نے بصرہ کی مسجد سے قصہ خوانوں اور
داستان سراؤں کو نکال باہر کیا تھا۔ مشرق میں قصہ خوانوں کو اس حد تک آزار پہنچایا گیا کہ آخر کار
وہ نیست و نابو ہو گئے اور ان کی جگہ ذاکرین اور واعظین نے لے لی۔ یہی واحد طریقہ ہے جس
کے ذریعے سچ اور مصدقہ باتوں کے اور فسانہ طرازی، جعل سازی اور کذب کے درمیان ایک
واضح سرحد قائم کی جا سکتی ہے۔'' (20)

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ سچ اور فسانے کے درمیان تنازعے کے حوالے سے مسلم دنیا
درست ہے کیونکہ ایک دوسرا تنازعہ بھی موجود ہے جو ہمیں شہریار اور شہرزاد کے تنازعے تک لے

جاتا ہے۔ اگر سچ، قانون اور اس کی پابندیوں کی قلمرو ہے

تو فسانہ دل بہلاوے اور لذت اندوزی کی دنیا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو راویتی یا جدید انتہا پسندوں کے لیے ناقابل ہضم ہے۔ شدادی ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ شہرزاد ایک مشکوک خصوصیت رکھتی ہے۔ ''شہرزاد کا تعارف ہم سے اس وقت کرایا جاتا ہے جب وہ کتاب کے صفحوں پر پہلی مرتبہ نمودار ہوتی ہے۔ اور اپنی اسناد کے مطابق وہ ایک جانی مانی فقیہ یعنی مسلم مذہبی حکم لگانے والی ہے'' (21) اس کا علم تاریخ، قرآن مقدس، ادب، شریعت اور مختلف فقہوں کی بنیادی کتابوں اور ان کی تفسیر و تشریح کا متاثرہ کن احاطہ کرتا ہے۔ علم کا یہ بے پناہ ذخیرہ جسے اس نے ایک ہزار سے زیادہ کتابوں کو پڑھ کر حاصل کیا ہے، اس کے ساتھ ہی وہ کسی جھجک کے بغیر رات اور داستان کی دنیا سے گہری وابستگی کا اظہار بھی کرتی ہے اور یہی چیز شہرزاد کو بہ طور خاص مشکوک بنا دیتی ہے۔ یہ ایک عجیب مظہر کے بارے میں بھی ہمیں بتاتی ہے اور وہ یہ کہ صدیوں تک عرب دنیا کے دانشوروں اور اہل علم نے اس کی داستانوں کو حقارت سے دیکھا، ان کا مذاق اڑایا اور اس بات کی زحمت بھی نہ کی کہ وہ ان داستانوں کو ضبط تحریر میں لے آئیں۔

جدید مشرق میں ہماری اس داستان گو کا حقوق انسانی کی علامت کے طور پر نمودار ہونے کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ چند مستثنیات کے علاوہ علم و ادب کی قدامت پرست اشرافیہ نے الف لیلہ ولیلہ کا تضحیک آمیز انداز میں مذاق اڑایا، اس کی تہذیبی اور ثقافتی حیثیت و اہمیت کو رد کیا اور ان داستانوں کو اہمیت نہیں دی کیونکہ یہ داستانیں نسل در نسل زبانی سنائی گئی تھیں (22)۔ مرد اشرافیہ زبانی سنائی جانے والی داستانوں کو جاہل عوام کی علامت ٹھہراتی تھی۔ کیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان داستانوں میں سے بیشتر عورتوں کی سنائی ہوئی تھیں جنہیں وہ خاندان کے نجی دائرے میں بیان کرتی تھیں؟ اس تجزیے کو درست ثابت کرنے کے لیے حتمی اور سائنسی شواہد موجود نہیں ہیں تاہم اس بات کا قوی امکان موجود ہے اور جب ہم الف لیلہ ولیلہ کی ''نسائیت'' کا مقام اپنے مردانہ مسلم ورثہ میں متعین کریں تو متذکرہ بالا بات ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی

چاہیے۔

الجزائر میں پیدا ہونے والے بن شیخ جو شہرزاد کی داستانوں کے ایک ہم عصر ماہر ہیں، وہ اس بارے میں اپنے شک کا اظہار کرتے ہیں کہ ان داستانوں کو اگر خرافات (بہکے ہوئے دماغ کا ہذیان) کے نام سے یاد کیا گیا تو کہیں اس کا سبب یہ تو نہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کی نسبت زیادہ ذہین اور چالاک کہا جاتا تھا۔(23) ان داستانوں کی منطق یہ ہے کہ منصف غلطی پر ہے اور ستم کا شکار ہونے والا حق پر ہے۔ ''شہرزاد جو ستم کا شکار ہوئی ہے وہ صرف بادشاہ کو انصاف کے ترازو میں نہیں تولتی بلکہ بادشاہ پر یہ حکم بھی لگاتی ہے کہ وہ شہرزاد کی خواہشات کے مطابق اپنے طور طریقے بدل دے۔ دنیا سر کے بل کھڑی ہو گئی ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں منصف اس سے بچ کر نہیں نکلتا جس پر ستم ہوا ہے'(24) یہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں رات کی روایات کا سکہ رواں ہے۔ ان داستانوں کے اختتامی جملے کی تکرار کو یاد کیجئے:

صبح شہرزاد پر غالب آئی

اور اس نے خاموشی میں مراجعت اختیار کی۔

جب رات کی چھائی ہوئی تاریکی سے موازنہ کیا جائے تو بادشاہ کا دربار اور اس کا نظام عدل اتنا نازک اور کمزور نظر آتا ہے جیسے دن میں کوئی سراب۔ اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ عرب اشرافیہ کو ان کے مطلق العنان حکمرانوں کی مالی مدد حاصل رہی اور اس بارے میں ان کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ الف لیلہ ولیلہ کا ذکر صدیوں تک توہین آمیز انداز میں کرتے رہے اور اسے سینہ بہ سینہ تاریخ کہہ کر تحریری ورثہ بننے کی راہ میں رکاوٹ رہے۔ یہ یورپی مصنفین تھے جنہوں نے 1704ء میں پہلی مرتبہ اس کی تدوین کی اور اسے تحریری شکل میں مرتب کیا۔ اس کے 100 برس بعد انیسویں صدی میں یہ داستان پہلی مرتبہ عربی میں شائع ہوئی۔ اس کے ابتدائی مرتبین میں سے کوئی بھی عرب نہیں تھا۔ اس کا پہلا عربی ایڈیشن کلکتہ میں 1814ء میں شائع ہوا۔ اس کو شائع کرنے والے ایک ہندوستانی مسلمان شیخ احمد شروانی تھے جو کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج

میں عربی کے استاد تھے۔عربی کا دوسرا ایڈیشن 1824ء
میں شائع ہوا۔جس کے مدیر میکسی ملین ہابخت تھے اور یہ برسیلاؤ (جرمنی) ایڈیشن کے نام سے معروف ہے۔اس کے دس برس بعد عرب ناشرین نے الف لیلہ ولیلہ کے ایڈیشن چھاپ کر پیسہ کمانا شروع کیا۔عرب دنیا سے شائع ہونے والا پہلا ایڈیشن 1832ء میں قاہرہ بلاق ایڈیشن کے نام سے سامنے آیا۔(25)

یہ بات دلچسپی سے دیکھی جانی چاہیے کہ الف لیلہ ولیلہ کے پہلے عرب مرتب نے بلاق ایڈیشن میں دخل اندازی کی ضرورت محسوس کی اور ''اس کی زبان کو بہتر بنایا اور ایک ایسی کتاب پیش کی جو مرتب کے خیال کے مطابق اصل سے بہتر ادبی معیار رکھتی تھی۔''(26)

الف لیلہ ولیلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے الجزائر کے محقق بن شیخ اس بات پر حیران ہوتے ہیں کہ یہ کتاب جو ہمارے مسلم ورثے میں ایک خاص مقام رکھتی ہے' اس کی داستان گو شہرزاد عورتوں کے ''کید'' یعنی مردوں کو نقصان پہنچانے کی ان کی خواہش کی تکذیب نہیں کرتی۔ بن شیخ کے مطابق شاید یہی وجہ ہے کہ عرب اشرافیہ نے ان داستانوں کو دائرہ تحریر میں لانے سے انکار کیا۔''داستان گو جس کا فرض تھا کہ وہ بے وفائی کا شکار ہونے والے بادشاہ کے وقار کو بازیاب کرتی' اس نے اپنی تمام صلاحیتیں ان داستانوں کو تخلیق کرنے میں لگا دیں جو بادشاہ کی عورتوں پر بے اعتباری کی تصدیق کرتی تھیں''(27) یہ طویل داستانیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ اس بات کی دلکش تصویر کھینچتی ہیں کہ حرم میں رہنے والی عورتیں جنسی معاملات میں کتنی بے قابو ہیں۔ان پر غیر مساوی قوانین لاگو کیے جانے کی صورت میں یہ توقع رکھنا خلاف عقل ہے کہ وہ ان قوانین کے سامنے سر جھکا دیں گی۔

بن شیخ کا کہنا ہے کہ ان میں سے ہر داستان میں مرد اپنی المناک تقدیر پڑھتے ہیں۔''ہم اس بات کو جانتے ہیں کہ بے وفائی کا خوف گہری جڑیں رکھتا ہے اور قدیم ثقافتوں میں اس کا اظہار کم وبیش اسی طور پر ہوا ہے۔ یہاں ہم ایک ایسے متن پر کام کر رہے ہیں جو عربی زبان

میں لکھا گیا ہے'' (28) عربی زبان کا استعمال تناؤ اور کشیدگی کو بہت بڑھا دیتا ہے کیونکہ یہ مقدس متن قرآن کی زبان ہے۔ان داستانوں کو قلم بند کرنا انہیں ''علمی'' ساکھ بخش دیتا ہے جو کہ خطرناک حد تک رسوا کن ہے۔جدیدیت نے شہرزاد کو بیسویں صدی کی عرب دانشوری کے منظرنامے پر مرکز نگاہ بنا دیا ہے کیونکہ سینکڑوں برس پہلے نویں صدی میں اس نے کئی بنیادی اور اہم فلسفیانہ اور سیاسی سوال اٹھائے تھے۔جن کے جوابات ہمارے سیاسی رہنما آج بھی نہیں دے سکے ہیں۔ان میں سے چند یہ ہیں:

کسی غیر منصفانہ قانون کی اطاعت کیوں کی جائے؟ کیا اس لیے کہ اسے مردوں نے تحریر کیا ہے؟

اگر سچ اس قدر عیاں اور ظاہر ہے تو پھر تصورات اور فسانہ طرازی کو پروان چڑھنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟

یہ مشرق کا معجزہ ہے کہ شہرزاد کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی گہری سوچ بچار اور اس کے ساتھ ہی وسیع فلسفیانہ اور سیاسی معاملات میں اس کی بے پایاں دلچسپی اسے اشتعال انگیز حد تک دلکش و دل جو بنا دیتی ہے۔شہریار اگر اس بات کو یقینی اور حتمی بنانا چاہتا تھا کہ اس کا کل وجود اسی کا رہے تو اس کے لیے لازم تھا کہ وہ اس سے عشق کرے۔قرب اور وصال کی ماہرانہ صلاحیتیں وہ واحد طریقہ تھیں جن کے ذریعے وہ اسے چند گھنٹوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر سکتا تھا۔

ایک ذہین عورت جو دنیا کے معاملات میں گہری دلچسپی رکھتی ہے' اسے لبھانے کے لیے مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ شہوت انگیزی کے فن میں مہارت رکھتا ہو۔شہرزاد کے ساتھ شہریار کا اختلاط اپنی انتہاؤں کو پہنچ جاتا ہے اور یہ وہ بات ہے جو ہمیں اس کتاب کی ابتداء کی طرف لے جاتی ہے کہ ہماری ملکہ پر کیا گزرتی ہے جب وہ مغرب کا رخ کرتی ہے؟

شہرزاد جب سرحدوں کو عبور کرتی ہے تو مغربی مصور اسے اپنے تصورات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اس پر کون سی تبدیلیاں مسلط کرتے ہیں؟

مغربی مصور اسے لبھانے اور ورغلانے کے کن دل

فریب ہتھیاروں سے آراستہ کرتے ہیں؟

ان کے تصورات میں کیا وہ کم یا زیادہ پُر اثر ہو جاتی ہے؟

کیا وہ اپنا ملکہ کا رتبہ برقرار رکھتی ہے یا اس سے محروم ہو جاتی ہے؟

ایک بات یقینی ہے: اور وہ یہ کہ ہم اس تاریخ سے حتمی طور پر آگاہ ہیں جب شہرزاد نے مغرب کی سرحد عبور کی۔ وہ 1704 کا سال تھا اور اس کی پہلی منزل پیرس تھی۔

(5)

شہرزاد مغرب میں

شہرزاد نے مغرب کا پہلا سفر ایک فرانسیسی عالم انٹواں گالاں کے ہمراہ کیا۔ گالان کو مصوری کے فن پارے جمع کرنے کا شوق تھا اور اس نے مشرق کے کئی سفر فرانسیسی سفیر کے سیکریٹری کے طور پر کیے۔ وہ الف لیلہ ولیلہ کا پہلا مترجم تھا۔ 1704ء میں وہ 58 برس کا ہو چکا تھا جب اس نے شہرزاد کی کہانی اس کی زبانی فرانسیسی میں منتقل کی۔

وہ ان کہانیوں کے سحر میں اس طرح گرفتار ہوا کہ اپنی زندگی کے آخری برس 1715ء تک ان کہانیوں کا ترجمہ کرتا رہا۔ اس کے تراجم کی بارہ جلدوں کی اشاعت میں 1704ء سے 1717ء تک تیرہ برس لگے اور دو جلدیں تو اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

اس دوران شہرزاد کی کامیابیوں کی انتہا نہیں تھی۔ اس نے وہ کر دکھایا جو صلیبی جنگ لڑنے والے مسلمان نہ کر سکے تھے۔ وہ اپنے لفظوں سے کٹر کیتھولک، پروٹسنٹ اور گریک آرتھوڈوکس عیسائیوں کو وجد میں لاتی رہی۔ ان کے دلوں میں گھر کرتی رہی۔

''گالان کے ترجمے کے نسخے انگلستان، جرمنی، اٹلی، ہالینڈ، ڈنمارک، روس اور بیلجیئم میں پھیلتے چلے گئے۔''(1)

فرانسیسی مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے تحریک دلانے والے مناظر، وصل کی دل آویز

ساعتوں اور عورت کے بدن کے پیچ وخم کے بیان سے
کنارہ کیا اور یہ بات کتاب کی شہرت میں معاون ہوئی۔ آخر ''عرب کے سلاطین، وزراء اور عرب یا ہندوستان کی عورتیں اگر ورسائی یا مارلے میں رہ رہی ہوتیں تو وہاں والوں کی طرح ہی اپنے جذبات کا اظہار کرتیں۔''(2)

شہرزاد کی کہانیوں نے عیسائی روحوں کو کسی ساحرہ کی طرح اپنے قابو میں کرلیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ عالم اور دانشور حسین حدادی کے مطابق ان کہانیوں کے ترجموں اور ''جعلی ترجموں'' کے انبار لگ گئے۔ اس کا کہنا ہے کہ ''1800ء تک ان جعلی ترجموں کی تعداد 80 سے تجاوز کر گئی تھی۔ یہ اتنے سنسنی خیز تھے کہ انہوں نے سارے یورپ کے تخیل کو بھڑکا دیا، اس میں عام پڑھنے والے بھی تھے اور پوپ اور ورڈز ورتھ جیسے شاعر بھی۔''(3)

اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ ان تمام ترجموں میں سے دانشور شہرزاد غائب ہوگئی۔ اس کی بہ ظاہر وجہ یہ لگتی ہے کہ مغرب والوں کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی اور وہ تھیں مہم جوئی اور جنس۔ اور ان میں سے آخری چیز کا اظہار عورت کی بدن بولی تک پھوہڑ پن کے ساتھ محدود کر دیا گیا تھا۔ عرب لفظ ''سمر'' کا مطلب رات میں تادیر باتیں کرنا ہے۔ وہ کرسچین یورپی کہانیوں میں پایا نہیں جاسکتا تھا۔ پوری ایک صدی تک الف لیلہ ولیلہ میں مغرب والوں کی دلچسپی اس کے مردانہ ہیرو کرداروں، سندباد، الہ دین اور علی بابا تک ہی تھی۔ شہرزاد کو 1845ء تک انتظار کرنا پڑا جب ایڈگر ایلن پو نے شہرزاد کی ایک ہزار دوسری رات کی داستان شائع کرائی اور اسے ذہین داستان گو کہہ کر داد دی گئی۔ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوئی جب میں نے سنا کہ ایڈگر ایلن پو نے شہرزاد کے کردار کو بہت دانائی سے برتا ہے۔ میں نے برلن کے کتاب گھروں میں پو کی کتاب کی تلاش شروع کر دی۔ میں نے سوچا بے چاری شہرزاد کو بحر اوقیانوس عبور کرنا پڑا کہ وہ اس انسان کو ڈھونڈ سکے جو اس کی ترقی یافتہ ذہانت کا ذکر کرے۔ اور اس کا بیان کرتے ہوئے اسے ''ایک دانش مند دوشیزہ'' کے نام سے یاد کرے۔

1704ء سے 1845ء تک وہ بے بسی کے ساتھ ورسائی اور فرانسیسی دربار کی اس دیوانگی میں گرفتار رہی جو یہ لوگ عورتوں کے فیشن کے بارے میں رکھتے تھے۔ فرانسیسی مترجم انتون گالان سے اس کا پہلا تعلق اس کی شہرت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ گالان کی مخاطب ورسائی کی عورتیں تھیں۔ اس نے اپنا ترجمہ شائع کرانے سے پہلے وہاں کی امیرزادیوں، رئیس زادیوں اور نواب بیگموں سے اس بارے میں مشورے بھی لیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے داستانوں میں سے کئی حصے حذف کر دیئے تھے۔

اس بات کا تذکرہ اس نے اپنی ڈائری میں 2 فروری 1709ء کو اس طور کیا ہے کہ ''میں نے الف لیلہ ولیلہ کی نویں جلد مادموزیل ڈی موسامونٹ کو دی تا کہ وہ اسے میڈم ڈچس ڈی بریساک کو پڑھ کر سنا سکے'' (4)

اس زمانے میں مشرق کی سب سے بڑی دلدادہ بادشاہ فرانس لوئی پانزدہم کی باضابطہ داشتہ مارکوئیس ڈی پومپاڈور تھی، اسے حرم کے ملبوسات اور عیش وعشرت سے دلچسپی تھی نہ کہ عورتوں کے تخریبی رجحانات سے۔ 1745ء میں لوئی پانزدہم نے جب اسے اپنی باضابطہ داشتہ کے طور پر ورسائی میں قیام کی اجازت دی تو اس نے اپنے ذاتی مصور کارل وان لو سے سلطاناؤں یا حرم کی ملکاؤں کی تین روغنی تصویریں بنوائیں جو اپنی خوابگاہ کی دیواروں پر آویزاں کیں۔ یہ تینوں عورتیں زیورات سے لدی پھندی تھیں، ان کی زلفیں آراستہ تھیں اور وہ شاندار اور قیمتی لباس میں تھیں۔ اس طرح حرم کی عورتوں کا تعلق ہمیشہ کے لیے غیر سنجیدگی، فضول خرچی اور نمائشی سطحی باتوں سے جوڑ دیا گیا۔ (5)

1778ء میں جب کہ انقلاب فرانس کا آغاز ہو چکا تھا خود بادشاہ بیگم میری اینٹونٹ ''سلطانہ'' کے لباس میں دربار میں جلوہ افروز ہوئی لیکن اس سے بیچاری شہرزاد کے اس تصور کو اجاگر کرنے میں ذرہ برابر مدد نہیں ملی کہ وہ ایک سیاسی مجاہدہ تھی جو ایک مطلق العنان طرز حکومت کے خلاف لڑ رہی تھی۔

الف لیلہ ولیلہ کی مہم جوئی اور شہوانی عیش وعشرت

کے علاوہ جنسی معاملات کے بارے میں بے دھڑک بیان وہ تیسرا عنصر تھا جس نے مغربی قارئین کو مسحور کر دیا۔ وہ ہر چیز کو ممنوعہ قرار دینے والے پادریوں اور ڈیکارٹ جیسے عقل پرست مفکر کے درمیان پھنسے ہوئے تھے۔(6) ان تراجم نے ان کے لیے اس مشرق کے دروازے کھول دیئے جہاں ایک داستان گو حسینہ جنسی معاملات کی بے دھڑک شناوری کرتی تھی اور جو ایک خطرناک اور بدمزاج شوہر کا دل بہلانے پر مجبور تھی۔ یہ داستان سیٹلائٹ کے ذریعے ''فون سیکس'' کی ایجاد سے صدیوں پہلے' اس ہنر سے آشنا تھی کہ کسی مرد کو بے دار کرنے کے لیے سب سے بڑا ہتھیار لفظ ہیں۔ یہ وہ بنیادی سبق ہے جو شہرزاد نے حمّال اور تین عورتوں کی داستان میں اٹھائیسویں رات بادشاہ کو دیا۔ حالانکہ اس داستان سرائی میں وہ بے پناہ فحش معاملات کے بیان کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتی' لیکن اس کا بنیادی پیغام سیاسی ہے۔ شہرزاد جب داستان سرائی کے لیے فحاشی کے میدان کا انتخاب کرتی ہے اس وقت وہ کوئی سیاسی پیغام دے رہی ہوتی ہے۔

یہ کہانی اس غریب محنت کش کے ذکر سے شروع ہوتی ہے جسے ایک عورت ''اٹھا'' لے جاتی ہے۔ شہرزاد اپنی داستان یوں آغاز کرتی ہے کہ اے خوش وخرم بادشاہ میں نے سنا ہے کہ بغداد شہر میں ایک کنوارا رہتا تھا جو حمال تھا۔ ایک دن وہ بازار میں کھڑا تھا' اس کا ٹوکرا اس کے پاس تھا کہ ایک عورت اس کی طرف بڑھی وہ نفیس ململ کی قبا پہنے تھی' چہرے پر ریشمی نقاب تھا' ہاتھ میں ایک رومال جس پر سونے کے تار سے کڑھائی کی گئی تھی اور اس کی شلوار میں بیلیں ٹنکی ہوئی تھیں۔ اس نے جب اپنا نقاب الٹا تو اس کی سیاہ خوبصورت آنکھیں' لمبی پلکیں اور چہرے کی ملاحت سامنے آ گئی۔ اپنی میٹھی آواز اور میٹھے انداز میں اس نے حمّال کو مخاطب کیا ''اپنا ٹوکرا اٹھاؤ اور میرے پیچھے چلے آؤ۔'' حمال کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا ''واہ کیا خوش نصیب دن ہے'' اس نے زیرلب کہا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔(7)

عربی کی عبارت میں جو بات کہی گئی ہے اس کا

مطلب ہے ''آج کے دن میں کس قدر پرکشش نظر آ رہا ہوں۔'' وہ جو اپنے آپ کو اور اس وقت کی صورتحال کو داد دے رہا تھا اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ اس عورت نے حمال کو ہدایت کی کہ وہ شراب کے بڑے شیشے' بہت سا گوشت' سبزیوں کے تھیلے' مختلف اقسام کے خشک میوے' کشمش' انجیر' بادام اور اخروٹ' غرض کھانے پینے کی وہ تمام اشیاء جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شہوت میں اضافہ کرتی ہیں' اپنے ٹوکرے میں بھر لے اور اس شاندار گھر میں لے کر چلے جہاں وہ اپنی دو بہنوں کے ساتھ رہتی ہے۔ لیکن جب حمّال اپنا کام کر چکتا ہے اور اسے اس کی مزدوری کے طور پر ایک دینار دیا جاتا ہے تو وہ جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ بہنوں میں سے ایک جو ذرا جھنجلا گئی ہے کہتی ہے کہ اسے ایک دینار اور دے دو اور تب حمّال اپنے ارادوں کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تین خوبصورت عورتوں کو ایک مرد کی ضرورت ہے۔

''خدا کی قسم' تم نے مجھے سامان اٹھانے کی جو مزدوری دی وہ میری محنت سے بہت زیادہ ہے' مجھے تو دو درہم بھی نہیں ملنے چاہئیں۔ لیکن میں تم لوگوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارا دل بہلانے کے لیے کوئی موجود نہیں۔ ایک میز کو چار پایوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ کھڑی ہو سکے لیکن تم تین ہو اور تمہیں چوتھے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مردوں کا عیش عورتوں کے بغیر مکمل نہیں اور اسی طرح عورتوں کے لطف کی تکمیل مردوں سے ہوتی ہے۔''(8)

لیکن حمّال کو اندازہ نہیں کہ ایک مزدور کے درجے سے بلند ہو کر بستر کا شریک ہونے سے پہلے ان بہنوں کے سامنے اسے کیا ثابت کرنا ہوگا۔ وہ تینوں عورتیں ٹھنڈے لہجے میں اسے یاد دلاتی ہیں کہ ''اگر کوئی فائدہ نہ ہو تو محبت کی ٹکے کی حیثیت نہیں''

''تم بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ میز بہت مہنگی ہے اور کھانے پینے کے سامان پر بھی بہت رقم خرچ ہوئی ہے۔ یہ بتاؤ کہ ہم اگر تمہارا دل بہلائیں تو کیا تمہارے پاس کچھ ہے جو اس کے

عوض تم ہمیں دے سکو؟ ہم تمہیں اس وقت تک یہاں
ٹھہرنے نہیں دیں گے جب تک ہم یہ نہ دیکھ لیں کہ تم کیا حصہ ڈالو گے۔ دوسری صورت میں تم ہمارے خرچ پر یہاں شراب پیو گے اور لطف اٹھاؤ گے۔'' (9)

ایک غریب شخص جنسی طور پر کس طرح پرکشش ہوسکتا ہے؟ یہ ایک مشکل سوال ہے جس کا حمّال کو سامنا ہے' وہ اپنی میزبان خواتین کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اپنی دانشورانہ صلاحیتوں اور حساسیت کی وجہ سے وہ ایک اعلیٰ درجے کا عاشق ہے۔

''تم میرا یقین کرو'' وہ التجا کرتا ہے۔''میں ایک سمجھدار اور دانشمند انسان ہوں۔ میں نے مختلف علوم کا مطالعہ کیا ہے اور علم حاصل کیا ہے۔ میں نے کتابیں پڑھی ہیں اور سیکھا ہے۔ میں شائستہ اور مہذب ہوں'' (10) اور جب حمّال اس بات کو تسلیم کر لیتا ہے کہ جنسی لذت حاصل کرنا اور دوسرے کو سیراب کرنا ایک ذہنی کام ہے تب ہی وہ بہنیں اجازت دیتی ہیں کہ وہ ان کی بزم طرب میں شامل ہوسکتا ہے۔

وہ ناؤ نوش میں مصروف ہوجاتے ہیں رات ہوچکی ہے اور وہ سب بہت خوشگوار اور دلچسپ باتیں کر رہے ہیں۔ تب وہ بہن اٹھتی ہے جس نے حمّال کو بازار سے ساتھ لیا تھا' لباس اتارتی ہے اور صحن کے درمیان بنے ہوئے حوض میں کود جاتی ہے۔ اور اپنے سینے' اپنی رانوں اور اپنی ناف کو دھوتی ہے۔ پھر وہ تیزی سے حوض سے باہر آتی ہے اور لپک کر حمّال کی گود میں بیٹھ جاتی ہے۔ اپنے شگاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھتی ہے۔

''میرے آقا' میرے محبوب یہ کیا ہے؟''

''تمہاری کوکھ''

''چھی۔ تمہیں شرم نہیں آتی'' وہ کہتی ہے اور اس کی گردن پر تھپڑ رسید کرتی ہے۔''

''تمہاری شرم گاہ'' وہ کہتا ہے اور تب دوسری بہن اسے چٹکی کاٹتی ہے اور چیخ کر کہتی ہے ''لاحول ولا۔ یہ ایک گھٹیا لفظ ہے'' اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ ایک بہن اس کے کان

مروڑتی ہے۔ دوسری طمانچہ مارتی ہے اور تیسری دو ہنٹر
رسید کرتی ہے......(11)

یہ مار پیٹ اس وقت تک جاری رہتی ہے جب حمّال آخر کار کھیل کے قوانین سمجھ جاتا ہے ۔ایک مرد درست طور پر عورت کی رانوں کے درمیان موجود شے کا درست نام نہیں جانتا اور حمّال اس بات کا اعتراف کر لیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ اس معاملے میں اس کی مدد کریں تب ہی زدوکوب کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

حمّال کو اس امتحان سے دوسری بہنوں کے ساتھ بھی گزرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح عریاں حالت میں حوض سے نکل کر آتی ہیں اور اس کی گود میں بیٹھ جاتی ہیں اور اس سے وہی سوال کرتی ہیں، ہر مرتبہ وہ ان کی مار پیٹ کا نشانہ بنتا ہے اور تب یہ بات اس کی سمجھ میں آتی ہے کہ اسے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ عورت کے جنسی عضو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ سبق جو وہ بار بار بھولتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ مرد کی حماقت ہے کہ وہ اس بات کا دعویدار ہو کہ وہ اس چیز کا نام جانتا ہے جو صرف عورت کے اپنے بس میں ہے۔یعنی اس کی جنس۔ یہ مردوں کا محض فریب نفس ہے کہ وہ اس شے کو قابو میں کر سکتے ہیں جس کا وہ درست نام بھی نہیں جانتے۔ الف لیلہ ولیلہ کے جو سیاسی پہلو اور جہتیں ہیں جن میں عورتوں کے حق خود اختیاری پر اصرار کیا گیا ہے، اسی وجہ سے 1980ء اور 1990ء کی دہائی میں مصری بنیاد پرستوں نے اس کتاب کے عوامی عربی ایڈیشن کو بار بار آگ لگائی۔ دو جلدوں پر مشتمل ایڈیشن 60 درہم یعنی دو ڈالر میں ہر شہر میں دستیاب تھا۔ حالانکہ یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ بنیاد پرستوں نے الف لیلہ ولیلہ کا جو سنسر شدہ ایڈیشن شائع کیا تھا وہ کتنی تعداد میں فروخت ہوا۔لیکن عرب دنیا میں کوئی بھی جنس کے بارے میں شہرزاد کے تفصیلی بیانات کو ہرگز فحاشی میں شمار نہیں کرتا۔

یہ بات ہمیں پھر اپنے بنیادی سوال کی طرف لے جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوا کہ روشن خیال مغرب جسے جمہوریت اور حقوق انسانی پر اس قدر اصرار ہے، اس نے شہرزاد کی ذہانت سے بھری

ہوئی شہوانیت اور اس کے سیاسی پیغام کو ان داستانوں

میں سے رد کر دیا؟ یہ سوال اس لیے اٹھتا ہے کہ گالان کے ترجمے کے دو سو برس بعد جب شہزاد کی یورپ میں شاندار واپسی ہوئی تو وہ یورپ جہاں ہر طرح کے انقلابات اور ترقی پسند خیالات کی دھوم تھی، وہاں ایک بار پھر شہزاد کو یرغمال بنالیا گیا اور اس مرتبہ یہ کام دو روسی فنکاروں Nijinsky اور Diaghilev نے کیا۔ ان دونوں نے اس کے بدن کو صرف جنسی لذت کے لیے شان وشوکت سے پیش کیا اور جدید پیرس میں اس کے ساتھ وہ کیا جو قرون وسطیٰ کے بغداد کا شہر یار کرنے میں ناکام رہا تھا، یعنی انہوں نے اس داستان گو کو خاموش کر دیا۔

سرگئی دیاغیلو 1910ء میں اپنے آبائی وطن روس کو چھوڑ کر اپنے طائفے Ballet Russes کے ساتھ پیرس آیا۔ اس نے اپنا بیلے ''شہزاد'' پیش کیا۔ جس کے ملبوسات Leon Bakst نے تیار کیے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی پورے یورپ میں حرم ملبوسات کا فیشن جنگل میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ خاص طور سے حرم شلوار جسے سب سے پہلے فرانسیسی پوشاک طراز Poiret نے تیار کیا تھا۔ بیچاری شہزاد پر اب یہ عذاب نازل ہوا کہ وہ صرف ناف سے نیچے زندہ تھی اس کے تن پر شلوار ضرور تھی لیکن وہ دماغ سے محروم کر دی گئی۔ وہ رقص کر سکتی تھی لیکن اس کے پیروں کی گردش Nijinsky کے قبضے میں تھی۔

Vaslav Nijinsky راتوں رات فن کے آسمان کا چمکتا ستارہ بن گیا۔ وہ دیاغیلو کے بیلے ''شہزاد'' میں سنہرا غلام بنا تھا۔ ''بدن پر بھورے رنگ کا پینٹ، چہرے پر مسکراہٹ، گردن میں موتیوں کی مالا۔ اسے جنسی استعمال کی چیز کے طور پر نہیں خود جنس کے طور پر پیش کیا گیا۔ پوشاک سے بے راہ روی کے وہ تمام انداز جھلکتے ہوئے جو انیسویں صدی کے آخری زمانے کا ذہن سوچ سکتا تھا۔ اجنبیت، دوجنسیت یعنی نسائیت اور مردانگی کا مغلوطہ غلامی کی خوبو، تشدد''(12)

نجنسکی میں نسائیت اور مردانگی کی جو خصوصیات اکٹھی ہوگئی تھیں انہوں نے اس کے شیدائیوں کی توجہ اس چیز پر مرکوز کی کہ جو عورتوں اور مردوں دونوں میں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ شہر

زاد کا صدیوں پرانا پیغام دونوں اصناف کے مختلف ہونے
پر اصرار تھا اور وہ مردوں کو مجبور کرتی تھی کہ وہ خود اپنے بارے میں سوچیں۔

اس پر سے طرفہ یہ کہ ''روسی بیلے نے صنف کے روایتی معیار کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ بیلے کمپنیاں اکثر جنسی قوت کار میں صنفی تقلیب کے عمل کو پیش کر رہی تھیں۔ جس میں غالب آنے والی عورت خواہش کر رہی ہے اور نسائی انداز رکھنے والے مرد کی خواہش کی جا رہی ہے''۔(13) مرد۔عورت کی قوت یا طاقت میں یہ تبدیلی دونوں صنفوں کے درمیان مکالمے کے حوالے سے یکسر متضاد تھی حالانکہ یہ وہ نکتہ ہے جس پر شہرزاد کی تمام داستانوں کی بنیاد ہے۔

نجنسکی کے بیلے نے ہالی ووڈ کو بھی متاثر کیا۔ وہ مشرقی رقص کی خالص جنسی جہت کو ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرے اور یوں اس کی کائناتی جہت کو دھندلا دیا گیا۔ یہ وہ روش تھی جو قدیم یونانی دیویوں کے طریقۂ عبادات میں بھی ملتی ہے۔ بہت سے عالموں کا کہنا ہے کہ مشرقی رقص جسے بیلی ڈانس بھی کہتے ہیں، اس شہوت انگیز رقص کو پہلی مرتبہ سامیوں نے ایجاد کیا تھا اور یہ عشق کی دیوی عشتار کے مندروں میں کیا جاتا تھا۔''بابل کی عشتار اپنے قدیم ترین روپ میں ماں دیوی ہے، ایک کنواری جو اپنی خواہش سے اپنے عارضی عاشق چنتی ہے اور جو تمام دیوتاؤں سے پہلے پیدا ہوئی ہے۔(14)'' عشتار کی تعظیم و تکریم کے لیے اور عورتوں کی فرماں روائی اور حقوق خود اختیاری کا جشن منانے کے لیے اس کے ماننے والے اس کے معبدوں میں رقص اور جنسی عمل کرتے۔ دیویوں کی عبادات کو پسپائی اور دیوتاؤں کا عروج ہوا تو عشتار کے مندروں اور معبدوں میں موجود عورتیں مقدس طوائفوں کے نام سے یاد کی جانے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشتار دیوی کے ہزاروں برس بعد، اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ مشرقی رقص کی روایت کے مطابق لوگ جب ایک تنہا عورت کو رقصاں دیکھتے ہیں تو ان کے اندر عجب طرح کے احساسات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ناقابلِ فہم پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آج مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں بیلی ڈانس کبھی کبھار ہی دیکھا جاتا ہے۔ وہ بھی بہ طور

خاص عورتوں میں' کیونکہ یکساں انداز میں بدن کی جنبش اور گوشت کا تھرکنا روحانیت سے یکسر خالی ہوتا ہے' یہ رقص ہالی ووڈ کی فلموں میں اکثر نظر آتا ہے۔ وینس اور فنیقیوں کی دیوی تانیت جو کہ دونوں ہی عشتار کا دوسرا روپ تھیں' ان کی پوجا مراکش میں اسلام کی آمد سے پہلے تک ہوتی تھی اور آج بھی بحر اوقیانوس کے کنارے بنے ہوئے متعدد غاروں میں نیم جادوئی اور نیم سحر انگیزی کی کیفیت میں یہ رقص آج بھی کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولائی عبداللہ کا مذہبی جشن جو کاسابلانکا سے چند کلومیٹر کی دوری پر منایا جاتا ہے۔ اس میں کٹر مذہبی پابندیوں کو رد کرتے ہوئے عورتیں اس جشن میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

صدیوں سے مائیں' خالائیں اور پھپھیاں چھوٹی بچیوں کو مشرقی رقص کے ابتدائی انداز سکھاتی چلی آئی ہیں تاکہ وہ اپنی خودمختاری کا اظہار کرسکیں۔ یہ رقص نسل درنسل منتقل ہوتا ہے اور یہ بدن اور ذات کی افزائش کی روایت اور رواج ہے۔ میں جو ایک لکھنے والی ہوں اور گھنٹوں کرسی پر گزارتی ہوں۔ میرے لیے مشرقی رقص میرا واحد مشغلہ اور میری جسمانی ورزش ہے۔ مجھے جاگنگ اور چاق چوبند رہنے کے لیے جسمانی ورزشوں سے نفرت ہے۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھانے والی دوسری خواتین کی طرح میں بھی کام ختم ہوتے ہی Agdal فٹنس سینٹر بھاگتی ہوں جہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ جہاں میں اس لیے جاتی ہوں کہ اپنے پسندیدہ رقص کے استاد ماجد کے رقص کی پیروی کرسکوں۔ واحد بات جو مجھے پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ماجد بڑی عمر کی پروفیسروں کی بجائے طالبات پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ لیکن میں یہ کہنے سے کبھی نہیں چوکتی کہ وہ تمام مسلمان جو اس کی کلاس لینے آتے ہیں ان کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے۔ ایک ایسی عرب دنیا جو تیز رفتار عالمگیریت کا شکار ہے اور جہاں ہر چیز سر چکرا دینے والی رفتار سے بدل رہی ہے اس میں عمر یا سماجی طبقے کی کوئی قید نہیں۔ سوائے عورتوں کی اس ضرورت کے کہ وہ خود کو طاقت سے روشناس کرانے کے لیے سحر انگیز مشرقی رقص کی یوں خواہاں ہیں جیسے وہ بھی کوئی

دوا ہے۔ اور یہ بات مجھے پھر ہماری اس پہیلی کی طرف

واپس لاتی ہے کہ وہ کیا بات ہے کہ جس کے سبب ہالی ووڈ کی فلموں میں دکھائے جانے والے حرم اور شہرزاد کی نمائندگی کرنے والے مناظر میں اپنی ذات کو تقویت دینے والے مشرقی رقص کی روحانی جہتیں غائب ہیں۔

ہالی ووڈ کی وہ فلمیں جن میں مشرق کی عکاسی کی گئی ہے مثلاً قسمت (1920)، شیخ (1921) تھیف آف بغداد (1924) پر گہرا اثر روسی بیلے اور ملبوسات کا تھا۔ Ballet Russes نے فرانس میں شاندار کامیابی کے بعد جب امریکہ کا دورہ کیا تو اس نے بیلی ڈانس کو نہایت غیر اہم آرائشی اور بھرتی کی چیز کے طور پر دکھایا گیا جس میں شیطانی بداعمالی کے لمحے بھی شامل کر دیے گئے۔ (15) وہ نسائی حسن جو ان فلموں میں دکھایا گیا، سچ تو یہ ہے کہ وہ ڈرا دینے والا تھا۔ آپ اسے ''مشرقی ویمپ'' کہہ لیں، یاد رہے کہ ویمپ کا لفظ ویمپائر سے نکلا ہے (16)۔ ہالی ووڈ کی ویمپائر کی جنسیت کو اجاگر کرنے کے لیے جو استعارہ دکھایا گیا وہ ایک مکڑی کا تھا جو بیچارے مرد کو اپنے تارِ عنکبوت میں پھانس لیتی ہے اور نیست و نابود کر دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ویمپ مرد سے مکالمے کو پسند نہیں کرتی بلکہ اس کے خوف میں اضافہ کرتی ہے۔

میری بہت سے مغربی مردوں سے ملاقات ہوئی ہے جن کا کہنا ہے کہ بچپن میں انہوں نے الف لیلہ ولیلہ کا باتصویر ایڈیشن پڑھا تھا، لیکن یہ ہالی ووڈ کی فلمیں تھیں جنہوں نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔ بہت سے مردوں نے یونیورسل پکچرز کی 'عربین نائٹس' کا ذکر کیا جو 1942ء میں بنی تھی اور جس میں Maria Montez نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ یہ شعلہ بہ داماں اداکارہ ٹیکنی کلر فلموں کی ماہر سمجھی جاتی تھی؛ وہ حرم کی عورتوں کی جھلک پیش کرتی تو اس کے بدن پر شفاف چولی اور لہنگے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ماریا مونتز کا ستارہ جب دھندلانے لگا تب بھی عربین نائٹس جیسی فلمیں بنتی اور کئی دہائیوں تک مقبول ہوتی رہیں جن میں کیبرے کی فضا دکھائی جاتی تھی۔ مورخ Matthew Bernstein کا کہنا ہے کہ یونیورسل پکچرز نے ''دوسری جنگ

عظیم کے دوران کروڑوں ڈالر کمائے۔ یہ کم خرچ والی
ایسی متعدد فلموں کے بنائے جانے کا سبب بنی جن میں نہایت کم لباس پہننے والی حرم کی عورتیں ٹیکنی کلر خیالی کہانیوں میں دکھائی جاتی تھیں۔ اور ماریا مونتز جن کی ہیروئن تھی اور جس میں ظالم اور مطلق العنان حکمران ہوتے تھے۔ 1944ء میں بننے والی Ali Baba and the Forty) (Thieve اور Cobra Woman جس کی سامنے کی مثالیں ہیں۔ یہ فارمولا دوسرے پکچرز اسٹوڈیو میں 1960ء کی دہائی کے دوران بھی دہرایا جاتا رہا اور اس نے قدیم ادوار اور بائبل کی کہانیوں کو بڑے اسکرین پر پیش کیا' ان کی سامنے کی مثالیں 1959ء میں بننے والی Solomon & Sheba اور Cleopatra ہیں۔''(17)

مغرب کی طرف سفر کرنے والی حرم کی عورتوں کا تعلق گھٹیا قسم کے بیلی ڈانس کے ساتھ ساتھ آرائش و زیبائش کی اشیاء کے ساتھ جوڑ دیا گیا۔ الف لیلہ ولیلہ میں بدن کی زیبائش کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ عورتیں اور مرد دونوں ہی اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ دلکش بنانے کیلئے ہمیں گھنٹوں حمام میں صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ شہرزاد کی داستانوں کی اس حسن افزاء جہت نے مغربی تہذیب پر ان داستانوں کے فلسفیانہ پیغام سے کہیں زیادہ گہرے اثرات مرتب کیے۔ حرم سے متاثر ہو کر کُحل (سرمہ) اور حنا (مہندی) جلد ہی مغرب میں حسن کی افزائش کا راز سمجھے جانے لگے۔ یوں نوآبادیاتی غلبہ کم سے کم ایک شعبے میں یکسر پلٹ گیا اور فاتح' مفتوح بن گئے۔'' حرم کی شہرت اور اثر کا ایک اشارہ افزائش حسن کے اس کے نسخوں کی مقبولیت میں دیکھا جاسکتا ہے۔'' یہ بات مغربی عورتوں پر مشرق کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے دو خواتین Regine Goutalier اور Yvonne Knibiehler نے لکھی۔ ''بالزاک کے گیسو تراش Cesar Birotteau نے حنا' کحل' خوشبودار مٹی کو ملا کر ''سلطانہ کا آمیزہ'' تیار کیا۔ اور یہ آمیزہ اتنا مشہور ہوا کہ اس کی فروخت سے اس نے دولت کمالی۔ یہ نسخے آج بھی یورپ میں بڑے پیمانے پر استعمال ہوتے ہیں۔(18)

بیسویں صدی کی ابتداء میں حرم کی آرائش

وزیبائش کے موضوع پر متعدد علمی مقالے سامنے آئے۔اس میں سب سے عجیب اور دلچسپ مادام AR. de Lenz کی کتاب Moroccan Harem Practices:Mgic, Medicine Beauty ہے لینز ایک فرانسیسی ڈاکٹر کی بیٹی تھی جو 20 کی دہائی میں مراکش میں مقیم تھی اور وہاں اس نے عورتوں سے ان کے حسن کا راز جاننے کے لیے انٹرویو کیے تھے۔ (19) یا تو لینز کو عربی پر عبور نہیں تھا یا وہ عورتیں جس کے اس نے انٹرویو کیے تھے وہ کبھی انٹرویو کے تجربے سے نہیں گزری تھیں' اس لیے بیشتر کے ''راز'' پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے ذہن کی ایسی قہقہہ بار ایجاد ہیں۔جنھوں نے اس کتاب کو حد سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

افزائش حسن کے حرم کے نسخے اس وقت تک نہایت مقبول رہے جب تک انیسویں صدی میں فرانس کے ایک کیمسٹ اور مائیکرو بایولوجسٹ Pasteur نے اور حفظان صحت کے اصولوں نے افزائش حسن کو منقلب کر کے اسے سائنسی خطوط پر کام کرنے والی فارماسیوٹیکل تجارت میں تبدیل نہیں کر دیا''(20)

آخری نتیجے کے طور پر،ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہرزاد کے بارے میں مغرب کی فہم شہرزاد اور حرم کی دنیا کے بارے میں محض سطحی' آرائشی اور سرسری تھی' اس داستان گو میں عورتوں اور مردوں کے درمیان مکالمے کی جو آرزومندی پائی جاتی تھی اس کی بازگشت مغرب تک نہیں پہنچی۔ میں بار بار اس نکتے پر سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہوا۔؟

برلن ائیرپورٹ پر میں تھکی ہاری بیٹھی تھی اور پیرس کے لیے اپنی پرواز کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ میری کتاب کی تشہیری مہم کی اختتامی منزل تھی۔ مجھے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا کہ میں حرم کی پہیلی کو بوجھنے میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکی۔یہی سب کچھ سوچتے سوچتے اچانک میرے ذہن میں یہ خیال کوندے کی طرح لپکا کہ مجھے کمال کو فون کرنا چاہیے۔اس سے ایک روز پہلے میں اسے اپنی یادداشتیں فیکس کر چکی تھی جو میں نے برلن میں کتابوں کی دکانوں میں حرم کے بارے میں دریافتوں

اور شہزاد بیلے کے بارے میں تحریر کی تھیں۔ میں اس کا
ردعمل جاننے کے لیے بے تاب تھی۔ میں نے قریب ترین بوتھ کے لیے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں، میں جانتی ہوں کہ جب مجھے گھر بےقراری سے یاد آنے لگے تو میں مراکش فون کرنے کے لیے روپے لٹانے لگتی ہوں۔لیکن اس وقت مجھے فون کرنے کے لیے قدرے ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ذرا عجیب سا لگے گا اگر میں اچانک کمال کو فون کر کے اس سے پوچھوں کہ مغربی مردوں کے تصورات وتخیلات کے حوالے سے جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کے بارے میں اس کا کیا خیال ہے۔ ہاں، زیادہ بہتر یہی تھا کہ میں مراکش سرے سے فون ہی نہ کروں۔

اچانک مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔کس چیز کی پیاس؟ مجھے کانچ کے شفاف گلاس میں پودینے کی خوشبو سے مہکتی ہوئی سبز چائے پینے کی شدت سے خواہش ہورہی تھی۔ ہاں...... میرا جی اسی چائے کو پینے کے لیے چاہ رہا تھا جو مراکش میں ملتی ہے جہاں چائے پینے کا زیادہ لطف اس بات میں آتا ہے کہ چائے پیتے ہوئے آپ کی نظر اس کے سنہرے پن پر رہے جو کانچ سے جھلکتا ہے۔ پودینے کی چائے کی خواہش مجھے اس قدر مضطرب کیے ہوئے تھی کہ میں نے اس اعلان پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی جس میں بتایا جارہا تھا کہ میری پرواز میں تاخیر ہوگئی ہے اور ابھی مجھے مزید ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ میں عربی میں زیرلب بڑبڑائی" مجھے یقین نہیں آرہا لیکن تقدیر نے مجھے موقع دیا ہے کہ میں مراکش فون کر ہی لوں۔" لیکن مجھے اس قسم کی فضول مداخلت سے گریز کرتے ہوئے فون نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایک گلاس چائے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ہاں، یہی درست ہے۔ میں کھڑی ہوگئی اور قریب ترین کیفے بار جا کر میں نے چائے طلب کی۔ چند لمحوں بعد میرے سامنے ایک بڑی سی غیر شفاف پیالی میں لپٹن کی گہری کالی چائے رکھ دی گئی۔ اسے دیکھتے ہی میری چائے پینے کی خواہش فوراً ختم ہوگئی۔ میں نے جلدی سے رقم ادا کی اور تیزی سے ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھ گئی۔

"ہیلو کمال؟ تم کیسے ہو؟" اس جملے کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ "سب کچھ ٹھیک ہے

نا؟''۔ ''میں تمہیں یاد کررہی ہوں اور گھر مجھے بے طرح
یاد آ رہا ہے''۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ دوسری طرف یکسر خاموشی ہے تو میں نے جلدی سے کہا۔

''فاطمہ مجھے محسوس نہیں ہو رہا کہ عرب دنیا میں تمہیں کسی کی یاد آ رہی ہے۔'' چند لمحوں کے سکوت کے بعد کمال کی آواز آئی۔ اگر ایک عرب مرد بہت پُرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں گفتگو کر رہا ہو تو یہ ایک بری علامت ہے۔ ''تمہاری یادداشتوں کو پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ تم مغربی مردوں کے سحر میں مکمل طور پر گرفتار ہو۔ تم ان سے اس قدر متاثر ہو کہ تم نے تو لگ بھگ پوری ایک کتاب ان کے بارے میں لکھ دی ہے۔''

اگر کہیں دور دراز سے فون پر بات ہو رہی ہو تو جھگڑنا ایک بہت مہنگی عیاشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں خاموش رہی۔ جس حد تک میں کمال کو جانتی ہوں' اس کی بناء پر مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے اخلاق برتنے کی بناء پر فوراً ہی شرمسار ہو جائے گا۔ اس وقت میں اس کی نظر میں بیچاری تھی جو مراکش کی گرم دھوپ سے اتنی دور یورپ کے سخت موسم کو جھیل رہی تھی۔ میری خاموشی میرے کام آ گئی۔

''ہیلو! فاطمہ کیا تم اب بھی رابطے میں ہو؟'' کمال کی آواز میں اب بہت تشویش تھی۔ ''معاف کرنا کہ میں نے اتنی بدتہذیبی سے بات کی۔ جہاں تم ہو وہاں تو موسم بہت سرد ہو گا۔'' پھر خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا' اور اس نے یوں کہا جیسے وہ خود کلامی کر رہا ہو۔ ''یہ ہو سکتا ہے کہ مغربی مرد اتنے دلچسپ نہ ہوں جتنا کہ تم انہیں سمجھ رہی ہو' ہو سکتا ہے کہ وہ کھیل میں ذرا سے مختلف داؤ پیچ آزما رہے ہوں۔ لیکن وہ بھی ہم عرب مردوں کی طرح عورتوں کے سامنے شکست تسلیم کرنے سے اتنے ہی خوفزدہ ہیں۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو کمال؟ عورتوں کے بارے میں ان کا رویہ مختلف کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے ظاہری سکون سے بات کرتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت میں ٹیلی فون ریسور کو تقریباً گلے لگائے ہوئے تھی۔ میں کمال کو بہ خوبی جانتی تھی اور وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور

سمجھ رہا تھا کہ حرم کے بارے میں میرے جو مسائل ہیں
اور جن کے اندرون سے وہ آگاہ ہے' اس حوالے سے میں ان معاملات کی تفصیل جاننے کے لیے مری جارہی تھی۔

''کمال۔ میری فلائٹ چھوٹ جائے گی۔'' آخرکار میں نے اسے یاد دلایا۔ یہ سن کر کمال نے زبان کھولی'' میرے خیال میں فاطمہ تم نے شہرزاد کے بارے میں ایڈگر ایلن پو کی کہانی آخر تک نہیں پڑھی۔ کیا تم نے پڑھی ہے؟ تم کتابیں خرید لیتی ہو اور دوسروں سے اس بات کی توقع رکھتی ہو کہ وہ اسے تمہارے لیے پڑھیں۔''

میں یہ بات تسلیم کرتے ہوئے شرمسار ہو رہی تھی لیکن میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ''ہاں! میں نے اسے پورا نہیں پڑھا تھا' بس شروع کے صفحوں پر نگاہ ڈالی تھی''

کمال کی آواز آئی'' اس امریکی ادیب نے اپنی کہانی میں شہرزاد کو قتل کر دیا تھا۔ کیا مسلمان مرد ایسا کرنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہے؟''

میں نے آہستہ سے ریسور کریڈل پر رکھ دیا اور کھڑی رہی۔ اس غیر ملکی ائیرپورٹ پر مجھے شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا۔

میں حیران پریشان سوچتی رہی کہ آخر پو نے شہرزاد کو قتل کیوں کر دیا؟ یہ مغربی مرد کتنے عجیب ہوتے ہیں۔

مردوں کی نگاہوں سے بچتے ہوئے بہت احتیاط کے ساتھ جہاز میں سوار ہوئی۔ لیکن پھر میں نے خود کو یاد دلایا کہ یہ امریکی نہیں جرمن مرد ہیں۔ اسی وقت مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ پو کے بزرگ جرمن رہے ہوں۔ اس کے علاوہ یہ سب لوگ اینگلو سیکسن تو ہیں ہی؟ شہرزاد کا قتل...... کس قدر بھیانک خیال ہے۔ میں اپنے آپ سے الجھتی رہی۔

کیا میں لاطینی یورپ میں محفوظ ہوں گی؟ میں سوچتی رہی۔

(6)
ذہانت بمقابلہ حُسن

شہرزاد کی ''ایک ہزار دوسری رات'' میں ایڈگر ایلن پو نے اسے نہ صرف ہولناک موت سے دوچار کیا بلکہ اس کا بھی دعویٰ کیا کہ وہ اپنی موت سے کج روی کے انداز میں لطف اندوز ہورہی تھی۔ ''اس کی گردن پر تانت کا پھندا تنگ ہورہا تھا تو اسے ایک گونہ تسکین ہورہی تھی......'' (1) ۔ پو کی کہانی میں شہرزاد مغرب کی تازہ ترین سائنسی دریافتوں سے واقف ہوچکی تھی۔ ان میں اعلیٰ ترین ٹیلی اسکوپ، الیکٹرو ٹیلی گراف اور تصویر کھینچنے کی تکنیک بھی شامل ہے، لیکن بادشاہ ان دریافتوں کو ناقابل یقین سمجھتا ہے اور شہرزاد کو جھوٹی قرار دیتا ہے۔(2) ''خاموش رہو، میں ان باتوں کو نہیں سن سکتا اور نہیں سنوں گا۔ جھوٹ کے اپنے اس طور مار سے تم نے پہلے ہی مجھے سر کے سخت درد میں مبتلا کردیا ہے...... کیا تم مجھے احمق سمجھتی ہو؟۔ میرے خیال میں تمہیں اب اٹھ کھڑا ہونا چاہیے تاکہ تمہارا گلا گھونٹا جاسکے'' (3)

ناواقف مردوں کو جدید سائنسی دریافتیں قصہ کہانی کی باتیں لگتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ پو نے اپنی اس کہانی کا ضمنی عنوان ''سچ کہانی سے زیادہ عجیب ہے'' (4) رکھا ہے جو کہ بہت مشہور ہے۔ پو کا بنیادی خیال یہ تھا کہ شہرزاد کو مغرب کی سائنسی ایجادات سے مسلم دنیا کو آگاہ کرنے والی کے طور پر پیش کرے، کیونکہ اس طرح اس کے شوہر کی فوجی طاقت میں اضافہ ہوگا اور وہ مشرق پر

مغرب کا قبضہ ختم کر سکے گا۔ یہ سائنسی دریافتیں تھیں جن سے مغرب نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور انیسویں صدی میں مسلمان ملکوں اور علاقوں پر قبضہ کیا۔ 1801ء میں نپولین نے مصر پر جب دوسری مرتبہ اپنا حملہ مکمل کیا تو اس کا سبب اس کی افواج سے کہیں زیادہ وہ مٹھی بھر سائنسدان تھے جو اس کے ساتھ تھے۔

پو کی کہانی میں شہرزاد سندباد کو طلب کرتی ہے جو اب گوشہ گیری کی زندگی گزار رہا ہے کہ وہ بادشاہ کو ان ایجادات کے بارے میں بتائے جو اس نے اپنے سفر کے دوران دیکھی تھیں۔ ریل کا انجن اور طاقتور دوربینیں جو ستاروں کے راز بتاتی ہیں۔ اگر شہریار نے ان باتوں پر کان دھرا ہوتا تو مسلم دنیا تیزی سے ترقی کرتی اور ہماری شہرزاد بھی زندہ رہتی۔ لیکن پو شہرزاد کے ساتھ غداری کرتا ہے اور اس کا رشتہ میکیاولی سے اور حد تو یہ ہے کہ حوا سے جوڑتا ہے۔ فتنہ وفساد کی جڑ حوا جو عیسائیت کی بنیاد ہے اور جس کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔ اسلام جو زوال آدم کے بارے میں کم عورت دشمنی رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں جو سانپ حوا کو ورغلاتا ہے اس کا قرآن کے زوال آدم میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔(5)

شہرزاد کی طرف سے شکوک میں مبتلا کرنے کے لیے پو ہمیں خبردار کرتا ہے کہ سیاسی ذہن رکھنے والی اس حسینہ نے نہ صرف میکیاولی کو پڑھا ہے بلکہ یہ ''حسب نسب کے اعتبار سے حوا سے تعلق رکھتی ہے اور گفتگو کی ان سات ٹوکریوں کی وارث ہے جو حوا نے باغ عدن کے پیڑوں کے نیچے سے اٹھائی تھیں۔''(6) پو اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ شہرزاد کی ساحرانہ صلاحیتوں کو اس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے کہ حوا اس کے سامنے طفل مکتب نظر آتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ شہرزاد کو باتوں کی سات ٹوکریاں ورثے میں ملی تھیں؛ مجھے یہ بھی اضافہ کرنا چاہیے تھا کہ پو نے اس میں سود در سود اضافہ کیا جس کے نتیجے میں وہ 77 ہوگئیں۔(7) یہ بات حیران کن نہیں کہ اتنے بھاری بوجھ کے ساتھ قصہ گو کا ستیاناس تو ہونا تھا لیکن میرے لیے اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ پو کی شہرزاد اپنے قتل کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔ وہ نہ راہ فرار اختیار کرتی ہے اور نہ اپنے

لفظوں سے اپنے ذہنی بیمار شوہر کو اپنے قتل سے باز رکھنے کی
کوشش کرتی ہے۔ نہیں! وہ اپنے قتل کے حکم کو سر جھکا کر تسلیم کر لیتی ہے۔"وہ یہ بات جانتی تھی کہ بادشاہ قاعدے قانون کا بہت پابند ہے اور اپنے احکامات کو واپس نہیں لے سکتا۔ اسی لیے اس نے وقار کے ساتھ اپنی تقدیر کو قبول کر لیا"۔(8)

شہرزاد کا اپنے قتل کے سامنے بے چوں چرا سر جھکا دینا مجھے اس قدر پریشان کر گیا کہ جب میں پیرس پہنچی تو محسوس ہو رہا تھا کہ کتاب کی تشہیری مہم میں حصہ لینا میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ میں شہرزاد کی ہولناک صورتحال کو اپنے اوپر منطبق کر رہی تھی۔ آج کی دنیا میں ایک مسلمان عورت اسی جیسی کیفیت سے دوچار ہے اور الفاظ اس کے واحد ہتھیار ہیں جن سے اپنے ساتھ روا رکھے جانے والے تشدد سے لڑتی ہے۔ مسلمان مرد تقدیر پرست ہو سکتے ہیں مگر مسلمان عورتیں اپنی تقدیر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال سکیں۔ شہرزاد نے کہا تھا کہ اپنی ہلاکت کو تسلیم کرنے سے پہلے ایک مسلمان عورت کو لڑنا چاہیے۔ دادی یاسمینہ نے یہ بات اتنی دہرائی تھی کہ میں اسے ایک مقدس سچ سمجھتی ہوں۔ آپ ایران کے اسلامی انقلاب پر ایک نظر ڈالیں۔ ایرانی عورتیں منقلب ہوگئیں اور بے خوفی سے سڑکوں پر مارنے مرنے لگیں۔ ووڈ رو ولسن انٹرنیشنل سنٹر فار اسکالرز میں ایک صحافی کے طور پر کام کرنے والی ہالہ اسفندیاری نے اپنے آبائی ملک ایران کے بارے میں لکھا "انتظامیہ کے دباؤ اور دھونس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے انہوں نے بہ طور عورت ایک نئے تشخص کا ادراک کیا۔ کام کرنے کے حق کے لیے وہ روزانہ جدوجہد کرنے پر مجبور کر دی گئیں۔ لباس کے بارے میں پابندیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے نت نئی حکمت عملی سے کام لیا اور عدالتوں میں طلاق کے حق کے لیے لڑائی لڑی۔"(9)

اپنی کتاب کی تشہیری مہم کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ میں کتنی نازک یا کمزور ہوں اور کتنی چیزوں سے خوفزدہ ہوں۔ مکالمہ آغاز کر کے اپنے خوف پر قابو پانے کی صلاحیت میں نے قرونِ وسطیٰ کی قصہ گو (شہرزاد) سے سیکھی۔ یہ درست ہے کہ میں ایک نئے ہزاریہ میں زندہ ہوں

اور سانس لیتی ہوں اور کمپیوٹر اور کار جیسی دوسری بہت سی
جدید سہولتیں رکھتی ہوں لیکن تشدد کے بارے میں میری خوف زدگی قرون وسطیٰ کی شہرزاد جیسی ہے۔ اسی کی طرح مجھے بھی روزانہ سیاسی تشدد کا کسی ہتھیار کے بغیر سامنا کرنا ہوتا ہے۔ صرف لفظ ہیں جو مجھے بچا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں شہرزاد کی امریکی تقدیر جان کر اس قدر خوفزدہ ہوگئی کہ پیرس پہنچنے کے بعد دریائے سین کی لہروں کے باوقار رقص کو دیکھ کر بھی میں اس منظر سے لطف اندوز نہ ہوسکی اور تب مجھے یہ خیال آیا کہ خوف یہ کرتا ہے کہ آپ کے سامنے دنیا کا حسن بکھرا ہو لیکن وہ آپ کو نظر نہیں آتا۔

اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ''عرب سائیکوتھیراپی'' سے کام لینا چاہیے۔ سادہ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے ذہن پر مسلط خیال کے بارے میں بے تکاں بولتے رہیں۔ خواہ کوئی آپ کو سنے یا نہ سنے۔ یا اسے آپ کی بات کی پرواہ ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ کسی نہ کسی دن کوئی سمجھ داری کا تبصرہ کر گزرے گا اور آپ کے مسئلے کا کوئی حل بتا دے گا۔ اور آپ کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل ہونے اور وہاں کے خرچ سے بچ جائیں گے۔ لیکن اس طریقہ کو اختیار کرنے میں ایک خرابی یہ ہے کہ آپ اپنے بہت سے دوستوں کو کھو دیتے ہیں۔ اس طریقے کو اختیار کرنے سے میں اپنی فرانسیسی ایڈیٹر کرسٹین کی دوستی سے محروم ہوتے ہوئے بال بال بچی۔ وہ ایک ایسی ایڈیٹر ہے جس کی رائے کو میں بہت زیادہ اہمیت دیتی ہوں۔ وہ مجھ سے بار بار یہ کہتی رہی کہ میں ایڈگر ایلین پو کے بارے میں مسلسل باتیں کر کے اپنی کتاب کی تشہیری مہم کو نقصان پہنچا رہی ہوں۔ ''صحافی جس وقت تمہارا انٹرویو کر رہے ہوں، اس وقت تم نے اگر گفتگو اپنی ذات پر مرکوز نہیں رکھی تو ان سے اس بات کی توقع مت رکھو'' اس کا کہنا تھا کہ ''وہ پھر پو کے بارے میں لکھیں گے اور تمہاری کتاب کو بھول جائیں گے۔'' میں نے کئی مرتبہ کرسٹین سے وعدہ کیا کہ میں اپنے آپ پر قابو رکھوں گی لیکن پو اور مغربی حرم کے بارے میں میری بے تکان باتیں اس وقت تک نہیں رکیں جب تک کہ میں جیکوئس سے نہیں ملی۔ اس نے مجھ سے ایسا برتاؤ کیا کہ جیسے میں بچی ہوں اور تاش

کے سارے پتے میرے سامنے کھول کر میز پر رکھ دیئے۔

''ایسا کرتے ہیں کہ پہلے ہم اپنی توجہ انٹرویو پر مرکوز کرتے ہیں'' اس نے کہا'' تاکہ میں اپنے رسالے کے لیے کچھ لکھ سکوں اور اپنی روزی روٹی کا انتظام کرسکوں۔ اس کے بعد میں پو کی کہانی کو سمجھنے میں تمہاری مدد کروں گا اور حرم کی پہیلی کو بھی۔''

اس کی تجویز مجھے بہت معقول لگی اس کے باوجود میں اس کی تجویز پر غیر شعوری طور پر ردِعمل ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''تم مجھے کسی امام یا خلیفہ کی طرح بات کرتے ہوئے محسوس ہو رہے ہو'' میں نے کہا ''یعنی تم اس وقت میری مدد کروگے جب میں تمہاری شرائط پوری کروں گی۔ کیا تم اپنے جملے کو زیادہ جمہوری انداز میں ادا نہیں کرسکتے اور تمہارے ذہن میں جو شرائط ہیں ان کو زیادہ واضح طور پر بیان نہیں کرسکتے؟''

''ہاں! میں شرائط کے بارے میں زیادہ واضح بات کرسکتا ہوں'' جیکوئس نے کہا '' میں تمہاری مدد کی خاطر تمہیں اپنے ذاتی حرم سے روشناس کرادوں گا۔ میں تمہیں پڑھنے کے لیے ایک کتاب دوں گا اور پھر تمہیں دو میوزیم دکھاؤں گا جہاں تم میری محبوب کنیزوں سے مل سکو گی۔ لیکن میری ان خدمات کے صلے میں تمہیں ہارون الرشید اور اس کے حرم سے مجھے متعارف کرانا ہوگا۔ اس جیسا ایک خلیفہ اپنے حرم میں کس طرح کا رویہ رکھتا تھا۔؟ میرا خیال ہے کہ میرے اور ہارون الرشید کے حرم کا تقابل ہم دونوں پر بہت کچھ اجاگر کردے گا۔''

میں نے اس کی پیشکش فوراً قبول کرلی' میرا خیال تھا کہ ہارون الرشید کے حرم کا جیکوئس سے تعارف مشکل نہیں ہوگا۔ دوسرے بہت سے عربوں کی طرح میں بھی یہ جانتی ہوں کہ میں اس خلیفہ کے سحر کے سامنے بے بس ہوجاتی ہوں۔ جسے کمال ''جنسی کشش رکھنے والے مطلق العنان حکمران'' کے نام سے یاد کرتا ہے اور میں قرونِ وسطٰی کے اس بادشاہ کی حرم میں اور حرم سے باہر کی تمام مہمات کی تفصیلات گھول کر پی چکی تھی۔ میں اس کے بارے میں ہر بات جانتی تھی۔

نویں صدی کے بغداد میں اسے کون سے کھانے مرغوب
تھے' وہ کیا پہنتا تھا اور ہاں اس کے معاشقوں کی تمام داستانیں مجھے از بر تھیں۔ اپنی یادداشت کو از سر نو تازہ کرنے کے لیے مجھے صرف چند گھنٹے درکار تھے جو میں پیرس کے ببلو تھک نیشنل میں گزاروں۔ یہاں آپ کو وہ تمام نایاب عرب مخطوطے مل جائیں گے جو فرانسیسی جرنیل نوآبادیاتی دور میں چرا لائے تھے۔ میں اس وقت نوآبادیاتی تسلط اور علم کے پھیلاؤ کے درمیان طنز آمیز تعلق کے بارے میں غور کر رہی تھی جب جیکوئس مجھے حقیقت کی دنیا میں کھینچ لایا۔

اپنی خوش وضع کنزوٹائی کی گرہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا ''میرے خیال میں میری پیشکش کو مزید جمہوری رنگ دینے کے لیے میں تم سے اس بات کی درخواست کر سکتا ہوں' خواہ تمہیں اس بات پر اعتراض ہی کیوں نہ ہو کہ تم سے ہارون الرشید کی طرح بات کرنا مجھ جیسے فرانسیسی شہری کے لیے جو جمہوریہ کے عائد کردہ بھاری ٹیکسوں کے نیچے دبا ہوا ہو' تم سے کیا جانے والا یہ اشتراک ایک دل خوش کن عمل ہے۔''

میں نے مشکوک ہو کر پوچھا۔ ''تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے؟''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت مجھے نہیں ٹوکو گی جب میں کوئی غلط بات کہوں ''جیکوئس نے بہت متانت سے کہا۔ ''تم میری بات میں غلطی کو درست کر کے زرد رنگ کے کاغذ پر لکھو گی اور چند منٹ بعد چپکے سے میرے حوالے کر دو گی''

میرے حلق سے بے ساختہ ایک قہقہہ نکل گیا اور مجھے فوراً خیال آیا کہ اس کی یہ بات مراکشی مردوں سے کس قدر ملتی جلتی تھی' وہ بھی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اسی طرح عاجزی یا بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ کیا یہ کوئی ایسی بات ہے جو بحیرۂ روم کے کنارے آباد تمام مردوں میں مشترک ہے؟۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے جیکوئس میں بحیرۂ روم کے مردوں کی خصوصیتیں تلاش کیں لیکن ان کی جھلک بھی مجھے اس میں نظر نہ آئی۔ وہ لگ بھگ پچاس پچپن برس کا خوش وضع اور باوقار مرد تھا۔ بالا قامت' چست بدن' جسے اپنی ہلکی سی نمایاں توند پر جیسے ناز تھا۔ اس کے

گل مچھے سلیقے سے کترے ہوئے تھے۔ نک چڑھے پن کا
اظہار کرتی ہوئی آنکھیں جو اتنی گہری نیلی تھیں کہ ان پر کسی جن کی آنکھوں کا گمان گزرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نسلی تعلق کسی جن سے نہ تھا اور جب میں نے اس بارے میں جیکوئس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی آنکھوں کے اس رنگ کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ برٹنی کا قدیم باشندہ ہے۔ اور اس کی آنکھوں کی کلبیت اور نک چڑھے پن کا سبب ''اس کی دو طلاقیں تھیں اور مستقبل میں جو بے وفائیاں اس کے ساتھ ہونے والی تھیں۔'' اس نے مجھ سے اس بات کا اعتراف کیا کہ میری ایڈیٹر کرسٹین اس کے لیے مثالی ''کنیز'' ہوسکتی تھی بشرطیکہ وہ اتنی خود بیں اور خود پسند نہ ہوتی۔ میں نے جب اس کے اس جملے کی صراحت چاہی تو اس نے بتایا کہ وہ درجنوں مردوں کو بیک وقت اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے۔ ''اس کے لیے لکھنے والے بیشتر مرد ادیب اس کے عشق میں گرفتار ہیں اور یہی حال ہم صحافیوں کا ہے۔ وہ جن کتابوں کو شائع کرتی ہے، ہم ان پر تبصرہ کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں، صرف اس لیے کہ اس طرح ہمیں اس کی ایک جھلک دیکھنے یا اس کے ساتھ شمپین کا ایک پیالہ پینے کا موقع مل جائے گا۔ اس سے تم اس کے حرم کی وسعت کا اندازہ لگا سکتی ہو۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیرس میں مرد ان عورتوں میں کشش محسوس کرتے ہیں جو اپنے شعبوں میں کامیاب ہیں۔ تاہم جیکوئس کا کہنا تھا کہ وہ اس مقابلے میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اور اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ بحرالکاہل کے کسی غیر آباد جزیرے پر کرسٹین کے ساتھ زندگی گزار دے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اووڈ کی کتاب ''عشق کا فن'' نکال لی جو بقول اس کے ان دنوں صرف پیرس کے مرد پڑھتے ہیں اور پھر اس میں سے ایک دل آویز نظم بہ آواز بلند مجھے سنانے لگا:

خوش نصیب ہے وہ مرد جو اپنی محبوبہ کے لیے جان جوکھم میں ڈال دے
خوش نصیب ہے وہ مرد جس سے وہ کہے کہ ''میں نے ایسا نہیں کیا تھا'' (اگر سچ ہو)
وہ فولاد کا بنا ہوا ہو یا دیوانہ یا آزار پسند ہو

یہ ہے وہ شخص جو کسی شک وشبے کے بغیر مکمل

تصدیق کا آرزومند ہوتا ہے

میں کہتا ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھا اور میں نشے میں نہیں تھا

اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں تمہارے خیال میں نشے میں بھی تھا اور نیند میں بھی

میں دونوں کو دیکھ رہا تھا اور میں نے تمہارے ابروؤں کی جنبش دیکھی

میں بتا سکتا ہوں کہ جب تم نے اپنے سر کو حرکت دی تو تم کیا کہہ رہی تھیں

اور تمہاری آنکھیں گونگی نہ تھیں اور تم نے میز کی سطح پر جو لکیریں کھینچیں

اپنی انگلیوں کو شراب کے پیالے میں ڈبو کر، ہر لفظ ایک اشارہ تھا

اور معدوم باتوں میں جو ذومعنی تہہ داریاں تھیں

راز و نیاز کی وہ باتیں جو اشاروں میں کہی گئیں

یہ نہ سمجھو کہ میں انہیں سمجھ نہیں سکا۔(10)

اووڈ کی اس نظم نے مجھے حیران کر دیا' اس لیے کہ اس کا مزاج مجھے بالکل عرب محسوس ہوا۔ جیکوئس بالکل کمال کی طرح تھا' اس قدر غیر محفوظ اور کمزور اس کے باوجود اپنی طرف کھینچتا ہوا۔ اووڈ کی نظم کو سن کر مجھے 1980ء کی دہائی کا ایک مقبول عربی گیت یاد آیا جسے مصر کے مشہور گلوکار عبدالوہاب نے گایا تھا۔ ساری عرب دنیا کے مرد اس گیت کے مصرعے اس وقت گنگنایا کرتے تھے اگر ان کی محبوباؤں کو آنے میں دیر ہو جائے۔ ''جھوٹ نہ بولو...... میں نے تم دونوں کو ساتھ دیکھا تھا۔'' میں نے جیکوئس کو یہ گیت گا کر سنایا تو اس نے فوراً کہا کہ اووڈ 43 قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا' اس وقت سے اب تک کچھ بھی نہیں بدلا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر حرم کی پہیلی بوجھنے میں مصروف ہو گئے۔

فن مصوری کی تاریخ جیکوئس کا خاص میدان تھی اور اسی لیے میں بے قرار تھی کہ وہ مجھے پیرس کے آرٹ میوزیم میں لے جائے تا کہ میں اس کے وہ پسندیدہ حرم دیکھ سکوں جنہیں مختلف

مصوروں نے کینوس پر اتارا ہے۔ مشرق میں اس کی گہری
دلچسپی نے اس کو نظر کا وہ بعید تر زاویہ دیا ہے جس کے سبب وہ ''پیرس کی صورتحال کے بارے میں ذہانت سے سوچ سکے اور جب یہاں کے محاذ پر برف گرنے لگے تو اس کا تخیل مراکش کی طرف محو پرواز ہو جائے۔'' اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے گھر کا سب سے چھوٹا بچہ تھا اور اس سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ اس نے پُر مزاح انداز میں کہا کہ فرائیڈ کی تشریح کے مطابق شاید یہی وجہ ہے کہ اسے حرم کے معاملات میں اس قدر دلچسپی ہے۔

دوسرے حساس مردوں کی طرح جیکوئس کی حس مزاح بھی اس کا زرہ بکتر تھی۔ یہ چیز اس میں ایک گڑ بڑا دینے والی کشش پیدا کرتی تھی، بالکل ویسی ہی جو عرب دانشوروں کو بے پناہ پُرکشش بنا دیتی ہے۔ آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ سنجیدہ ہیں یا مذاق کر رہے ہیں۔ آپ کو اندازے لگانے ہوتے ہیں اور جب آپ کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ سنجیدہ ہیں تو اچانک آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ اس وضع کا مرد کسی بھی عورت کو اپنے بارے میں زیادہ سنجیدہ ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ کسی بھی عرب مرد کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں کہ وہ آپ کے سامنے تسلسل سے تین مرتبہ کہے کہ آپ سحر ناک ہیں اور آپ یہ سن کر گلاب کی طرح کھل اٹھیں اور صرف تیس منٹ بعد آپ کے بارے میں سب کچھ بھول جائے۔ اگر کہیں آپ اس نتیجے پر پہنچ گئیں کہ وہ آپ سے والہانہ عشق میں مبتلا ہو چکا ہے تو یہ گمان خودکشی کے مترادف ہے۔

میں نے جب کرسٹین سے جیکوئس کی کشش کے بارے میں گفتگو کی تو اس نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا ''وہ ایک صحافی کے طور پر بے حد اہم ہے، اگر وہ کسی کتاب پر لکھے تو ہزاروں فرانسیسی اس کتاب کو خریدنے کیلئے دوڑ پڑیں گے۔ لیکن میں ایک مرد کے طور پر اس کا ذرہ برابر اعتبار نہیں کرتی'' اسے جیکوئس کا یہ خفیہ منصوبہ بتائے بغیر کہ وہ اسے ایک غیر آباد جزیرے پر اڑا لے جانا چاہتا ہے، میں نے کرسٹین سے اس کے جملے کا مطلب پوچھا تو وہ کہنے لگی ''ہم ایڈیٹر صحافیوں کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں'' پھر وہ کہنے لگی ''میری جان، یہاں پیرس کے قلب

میں،ہم ایک جدید حرم رکھتے ہیں'' جب میں نے اس پر زور
ڈالا کہ وہ اپنی بات ذرا زیادہ صراحت سے کرے تو اس نے کہا کہ جیکوئس مضحکہ خیز حد تک حاسد مرد ہے اور اسے آج کی عورتوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے مشکل ہوتی ہے' وہ ایک اترا ہٹ بھرا مرد ہے اور تب کرسٹین نے میرے اس جملے پر قہقہہ لگایا کہ رباط میں مجھے اترا ہٹ بھرے مردوں سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ وہ عورتوں کے بارے میں اپنے منفی جذبات کا اظہار کھل کر کرتے ہیں۔''وہ دوسرے ہوتے ہیں جو مجھے شبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ مجھے دماغی خلل کا شکار کر دیتے ہیں۔''

کرسٹین سے اس گفتگو کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے جیکوئس کی شرائط کو تسلیم کر لینا چاہیے۔اس کا مضمون جب وقت پر چھپ گیا تو میں نے سکون محسوس کیا کیونکہ اس مضمون میں ممکنہ تاخیر کے حوالے سے اس نے مجھے برا بھلا کہا تھا۔اس کے بعد ہی جیکوئس نے اپنے حرم کے بارے میں مجھے بات کرنے کی اجازت دی۔ ہم لوور میوزیم کے مقابل ریوڈی ریوالی کے ایک کیفے میں بیٹھے تھے جب اس نے مجھے ایک پراسراری کتاب دی۔اور اس بات پر اصرار کیا کہ پہلے میں اس کتاب کو پڑھوں۔''یہ کیفے انتہائی مناسب جگہ ہے جہاں دانشور خود کو اذیت دیتے ہیں'' اس نے مجھ سے ملتے ہی کہا''یہاں سرخ چمڑے کے آرام دہ دیوان ہیں اونچی چھتیں شور کو جذب کر لیتی ہیں اور بہت تیز سیاہ قہوہ ملتا ہے۔ میں تمہیں یہاں سے دو گھنٹے بعد لینے کے لیے آ جاؤں گا۔اور اپنی پہلی کنیز سے ملاقات کے لیے لے چلوں گا۔ تم دو گھنٹے میں اس کتاب کو بہ آسانی پڑھ لوگی۔''

وہ ایمانوئیل کانٹ کی کتاب Observations on theFeeling of the Beautiful and Sublime تھی۔ جیکوئس نے رخصت ہوتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ مغربی لوگوں کو سمجھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کے فلسفیوں کو پڑھا جائے۔ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں ایمانوئل کانٹ سے واقف ہوں؟ میں اپنے جہل کو چھپانے کے لیے کبھی

جھوٹ نہیں بولتی کیونکہ اس طرح سیکھنے کے شاندار مواقع
ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے میں نے بہادری سے اس بات کا اعتراف کیا کہ میں نے اسے کبھی
نہیں پڑھا۔ میں اس کے بارے میں بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ جرمن نژاد تھا اور ایک اہم مفکر'
پڑھے لکھے اور شائستہ مغربی جس کا ہمہ وقت حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ جیکوئس میرے اس اعتراف
جہل پر حیران رہ گیا اور اس نے پوچھا کہ ہائی اسکول میں میرا نصاب کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا
کہ پرائمری اسکول میں مجھے قرآن حفظ کرایا گیا اور سیکنڈری اسکول میں دور جاہلیہ کی شاعری۔
میرے آبائی شہر فیض میں ایمانوئل کانٹ سے میری ملاقات کا امکان صفر کے برابر تھا۔ یہ سن کر
جیکوئس نے قہقہہ لگایا اور کہا کہ شاید یہ اچھا ہی تھا کیونکہ عورتوں کے بارے میں کانٹ کے خیالات
کچھ اچھے نہیں ہیں۔ تاہم اسے پڑھنا اس لیے لازمی ہے کہ ایڈگر ایلن پو کے ہاتھوں میری قصہ
گو کا قتل سمجھ میں آ سکے اور مغربی حرم کی پہیلی کو بوجھنے کے لیے بھی کانٹ کی تفہیم ضروری ہے۔

کانٹ کے مطابق ایک ''عام'' عورت کا دماغ ''نفیس محسوسات'' کے لیے بنا ہے۔ اسے
''گہری فہم وفراست'' تجریدی قیاس اور خیالات یا علم کی کارآمد مگر خشک شاخوں پر غور وفکر سے
دستبردار ہو جانا چاہیے اور انہیں مردوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ کانٹ کا کہنا ہے کہ
''اگر سخت مشقت کے بعد کوئی عورت ان شعبوں میں کامیاب بھی ہو جائے تو وہ تمام خوبیاں تباہ
و برباد ہو جاتی ہیں جو اس کی صنف کا تقاضا ہیں اور یہ اتنی نادر بات ہے کہ اس کی سرد مہری سے داد
وتحسین تو کی جا سکتی ہے لیکن اس کی وہ تمام کششیں کمزور پڑ جاتی ہیں جس کے ذریعے وہ صنف
مخالف پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔'' (11)۔ کانٹ حسن اور دماغ کو جس طرح دولخت کرتا
ہے' اس کے اس فلسفے نے پہلے تو مجھے خوف زدہ کر دیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کانٹ کی عورت کو کس
قدر خوفناک انتخاب کا سامنا ہے۔ یا وہ حسن کا انتخاب کرے یا ذہانت کا۔ یہ اتنا ہی ظالمانہ
انتخاب ہے جتنا کہ بنیاد پرستوں کی دھمکیاں۔ حجاب پہن لو اور محفوظ ہو جاؤ یا بے حجاب پھرو اور
حملے کے لیے تیار رہو۔ میرا جی چاہا کہ اس قدر گڑبڑا دینے والی کتاب کو ایک طرف پھینک دوں

اور پیرس کے اس کیفے سے لطف اندوز ہوں، اس الجھن میں گرفتار نہ ہوں کہ دنیا میں ہر جگہ مردوں اور عورتوں کو ایک ساتھ خوش رہنے میں اتنی مشکلات کیوں درپیش ہوتی ہیں۔ لیکن اسی وقت مجھے دادی یاسمینہ کی یاد آئی جن کا کہنا تھا کہ سفر تفریح کے لیے نہیں سیکھنے کے لیے کیا جاتا ہے، سفر سرحدوں کو عبور کرنے اور اجنبیوں کے خوف پر قابو پانے، دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے اور خود کو زیادہ بااختیار بنانے کا عمل ہے۔ سفر آپ کو یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ آپ خود کون ہیں اور آپ کی اپنی تہذیب آپ کو کس طرح اپنے دائرہ اختیار میں رکھتی ہے۔

ایمانوئیل کانٹ کو پڑھتے ہوئے میرے سامنے نئے افق کھل گئے۔ اس یادگار صبح جب میں ریوڈی ریوالی کیفے میں بیٹھی تھی۔ مغرب و مشرق کے بارے میں نئے سوالات نے میرے ذہن پر یلغار کر دی، یہ وہ سوال تھے جو میں نے بعد میں پیرس کے اپنے مشیروں جیکوئس اور کرسٹین کے سامنے رکھے۔

کانٹ کا پیغام بہت بنیادی اور سادہ ہے۔ نسائیت، حسن ہے اور مردانگی ارفع و برتر۔ حیوانی اور جسمانی سطح سے بلند ہو کر تخیل کی پرواز، ارفع و برتر ہونا ہے، آپ کو اس تفریق کو بالکل سادہ انداز میں سمجھنا چاہیے۔ وہ عورت جو ذہین ہونے کی جرأت کرتی ہے اسے موقع پر ہی سزا دے دی جاتی ہے۔ وہ بدصورت ہے۔ کانٹ کی کتاب اور کسی مسلمان امام کے لہجے کی کاٹ میں کوئی فرق نہیں۔ کانٹ جسے ''جرمن روشن خیالی کا روشن چراغ''(12) کہا جاتا ہے۔ اس میں اور امام میں واحد فرق یہ ہے کہ اس فلسفی کو نجی (عورت) اور عوامی (مرد) حدود کی تقسیم سے کوئی غرض نہیں، وہ اسے حسن (عورت) اور ذہانت (مرد) میں بانٹ کر دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہارون الرشید جو ایک خلیفہ تھا وہ حسن اور علمی فضیلت کو مساوی سمجھتا تھا تب ہی اپنے حرم میں ایک ذہین اور برجستہ گفتگو کرنے والی جریہ کو شامل کرنے کے لیے بے پناہ دولت خرچ کرتا تھا۔ جبکہ کانٹ کی مثالی عورت قوت گویائی سے محروم تھی۔ کانٹ کے مطابق علم و فضل نہ صرف عورت کی

کشش کو غارت کر دیتا ہے بلکہ اس علم وفضل کا اظہار اس
کی نسائیت کو یکسر ختم کر دیتا ہے ''مادام ڈاسائرDacier کی طرح اگر کسی عورت کے دماغ میں یونانی بھری ہوئی ہو یا مارکوئیس ڈی شائے لیٹMarquise De Chatelet کی طرح وہ میکانکس کے بنیادی متنازعہ فیہ معاملات کو اپنے دماغ میں لیے پھرتی ہو تو پھر اس کے ایک داڑھی بھی ہونی چاہیے''(13) مادامDacier (1654-1720) نے ایلیاڈ، اوڈیسی اور دوسری یونانی اور لاطینی کلاسیکی کتابوں کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا تھا اور والٹیر کی دوست Marquise Chatelet نے 1738ء میں اپنے ایک مقالے ''آگ کی فطری خصوصیت'' پر فرنچ اکیڈمی آف سائنس سے انعام حاصل کیا تھا(14)

مجھ پر اچانک اس بات کا انکشاف ہوا کہ مجھے مشرق ومغرب کے درمیان ایک بنیادی اور اساسی فرق معلوم ہو گیا ہے۔ میں جب اپنی بعید ترین یاد کو کھنگالتی ہوں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب بھی میں کوئی غلط بات کرتی ہوں تو براہ راست یا کسی کہانی کے ذریعے مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک احمق عورت کہیں نہیں پہنچتی۔ مجھے شہرزاد کی ہیروئنوں میں سے ایک توڈد کا خیال آیا جو ایک کمال سائنسدان تھی۔ دادی یاسمینہ جو ناخواندہ تھیں، وہ مجھ سے یا مجھ میں بڑی اور پڑھی لکھی میری کسی عم زاد سے کہتیں کہ تودد کی داستان کو پھر سے سنائیں تاکہ اس کا پیغام میرے ذہن میں راسخ ہو جائے۔

خلیفہ نے توڈد سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''۔جس کا اس نے جواب دیا کہ ''میرا نام توڈد ہے''۔

تب خلیفہ نے سوال کیا ''اے تودد علم کی کتنی شاخوں اور شعبوں میں تجھے کمال حاصل ہے؟''

اس سوال کے جواب میں اس نے کہا کہ ''میرے آقا میں ترکیب نحوی اور شاعری میں طاق ہوں۔ میں فقہ، تفسیر اور فلسفہ جانتی ہوں۔ میں موسیقی، دینیات کے قوانین، ریاضی، تقسیم

اراضی، جیومیٹری اور زمانۂ قدیم کی حکایات سے واقف
ہوں۔اس کے علاوہ میں نے سائنس کے مختلف علوم، جیومیٹری، فلسفہ، طب، منطق، خطابت اور موسیقی کے سُروں کی ترتیب کا فن سیکھا ہے، مجھے بہت سی چیزیں حفظ ہیں اور شاعری کی میں عاشق ہوں۔ میں بانسری بجاسکتی ہوں اور اس کی پوری سپتک، سرتان، اس کے چڑھاؤ اور اس کے اتار سے آگاہ ہوں۔ اگر میں نغمہ سرا ہوں اور رقص کروں تو لبھاتی ہوں، اگر میں آرائش وزیبائش کروں اور خود کو عطریات میں بساؤں تو قتل کرتی ہوں۔ مختصراً یہ میرے آقا کہ میں اس اوج کمال پر ہوں جس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو علم میں کامل ہیں۔'' (15)

آقا اور کنیز کے درمیان ہونے والے اس مکالمے میں تو دّدا اپنے آپ کو فروخت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ خلیفہ نے اپنی توجہ کے جو چند لمحے اسے عطا کیے، ان میں اسے موقع ملا کہ وہ نہ صرف حرم میں موجود دوسری عورتوں سے مسابقت کر سکے بلکہ محل میں منڈلانے والے اور حکمران کی توجہ کے طلب گار مرد عالموں اور فنکاروں سے بھی مقابلہ کرے۔ حرم میں رہنے والی عورت کے لیے اس کے سوا کوئی متبادل نہیں کہ وہ اپنی تمام صلاحیتیں اپنی ذہانت کو صیقل کرنے میں صرف کر دے۔ کانٹ کی ہدایت پر عمل کرنا اور معمولی درجے کی ذہنی صلاحیت پر اکتفا کرنا اس کے لیے خود کشی کے مترادف تھا۔

کانٹ کے کہنے کے مطابق عورتوں کو جیومیٹری، علم الٰہیات یا تاریخ نہیں پڑھنی چاہیے یعنی وہ تمام شعبے جو خلیفہ کا دل مٹھی میں کر لینے والی کسی حسینہ کے لیے لازم تھے۔ اس فلسفی کا کہنا ہے کہ ''الغروطی Algarotti نے عورتوں کو نیوٹن کی کشش ثقل سمجھانے کے لیے جو تصریحات کی ہیں، اگر عورتیں اس سے بالکل ناواقف ہوں تب بھی ان کی کشش اور ان کے سحر میں کوئی کمی نہیں آئے گی'' (16) الغروطی ایک کاؤنٹ تھا جس نے 1736ء میں اس مفروضے کے تحت نیوٹن کے نظریات کو آسان انداز میں عورتوں کے لیے Newtonianismo per le Dame لکھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ عورتیں نیوٹن کی اصل کتاب کو سمجھنے کی اہل نہیں ہیں۔

ریاضی کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبے تاریخ اور جغرافیہ ہیں جو عورت کے حسن کو غارت کر سکتے ہیں۔ کانٹ کا کہنا ہے کہ ''تاریخ پڑھتے ہوئے وہ اپنے کاسئہ سر کو لڑائیوں کی تفصیلات اور جغرافیے میں قلعہ بندیوں کے معاملات سے نہیں بھریں گی۔ کیونکہ اس طرح ان کا سر بارود کی بو سے چکرا جائے گا۔ جس طرح مردوں کا سر مشک کی خوشبو سے چکرا جاتا ہے۔''(17) اور جغرافیے کے بارے میں ایک عورت کو بس اتنا ہی جاننا چاہیے کہ وہ دلچسپ گفتگو میں حصہ لے سکے۔ لیکن وہ اتنا نہ جانے کہ سنجیدہ علمی بحث کر سکے۔ ''خواتین کے لیے یہ دل بہلاوے کا مشغلہ ہے کہ وہ کسی نقشے کو ملاحظہ کریں یا ان کے سامنے گلوب رکھ دیا جائے یا دنیا کے اہم حصوں کا نقشہ......لیکن اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ وہ ان زمینوں کی تقسیم در تقسیم یا ان کی صنعتوں، ان کے اقتدار کی قوت، ان کے حکمرانوں کے بارے میں جانتی ہوں۔ اسی طرح انہیں کائنات کے بارے میں زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ کسی خوبصورت شام آسمانوں کا نظارہ کرنا انہیں دل خوش کن محسوس ہو، یا بس اگر وہ اس حد تک سوچ سکیں کہ دوسری دنیائیں اور ان میں زیادہ خوبصورت مخلوقات پائی جا سکتی ہیں'' (18)

اسے پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کتنی عجیب بات ہے کہ قرون وسطیٰ کے مشرق میں ہارون الرشید جیسا مطلق العنان حکمران گستاخ و بے باک اور ذہین کنیزوں کو سراہتا تھا جبکہ اٹھارہویں صدی کے یورپ میں کانٹ جیسا فلسفی قوت گویائی سے محروم عورتوں کے خواب دیکھ رہا تھا! محسوسات اور تعقل کے درمیان اتنا ناقابل یقین فصل! کانٹ کے روشن خیال مغرب میں بنی نوع انسان کی ایک نسل نہیں پائی جاتی جو محسوس کرتی ہو اور سوچتی ہو بلکہ وہاں دو بالکل مختلف قسم کی مخلوق آباد ہے۔ ایک وہ ہے جو محسوس (عورت) کرتی ہے۔ اور اور دوسری وہ ہے جو سوچتی (مرد) ہے۔ اس کے روشن خیال مغرب میں عورت وہ مخلوق ہے جس کا ''فلسفہ تعقل نہیں بلکہ محسوسات پر منحصر ہے۔'' (19)

ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے؟ میں کیفے میں
بیٹھی سوچتی رہی۔ کیا پو نے شہرزاد کو اس لیے قتل کیا؟ کیا اسی لیے مغربی مرد اپنے حرم میں اتنے ہشاش بشاش رہتے ہیں؟

تاہم پو نے شہرزاد کو ایک غیر معمولی ذہن بخشا تھا۔ اس سے تین سال پہلے فرانسیسی ادیب TheoPhile Gautier بھی اپنے ناولٹ La Mille et Deuxieme Nuite (1842) میں شہرزاد کو قتل کر چکا تھا۔ لیکن اس کے قتل کا سبب یہ تھا کہ شہرزاد کے پاس کہنے کو اب کوئی نئی بات نہیں رہی تھی (20) جبکہ پو نے اسے اس لیے ہلاک کیا کہ وہ بہت زیادہ جانتی تھی۔

مغربی اور مشرقی مرد حسن کے اتنے مختلف مثالیوں کے خواب کیوں دیکھتے ہیں؟ اور حسن کے بارے میں تصورات ہمیں کسی تہذیب کے بارے میں کیا بتاتے ہیں؟

کانٹ جیسا مغرب کا ایک ترقی پسند مرد جسے انسانی تمدن کی ترقی کا اس قدر خیال تھا' وہ ایک ایسی عورت کیوں چاہتا تھا جس کا دماغ مفلوج ہو۔

کیا مسلم دنیا میں عورت کے خلاف تشدد کا سبب یہ ہے کہ اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ دماغ رکھتی ہے جبکہ مغرب میں عموماً انہیں گہرے یا تجزیاتی خیالات کا اہل نہیں سمجھا جاتا؟

یہاں تک سوچنے کے بعد میری طبیعت مالش کرنے لگی اور مجھے اختلاج قلب ہونے لگا۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا کہ شاید جیکوئس آ گیا ہو' پھر مجھے خیال آیا کہ وہ مراکشی مردوں کی طرح ہمیشہ دیر سے آتا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی کو دیکھا ہمارے مقررہ وقت میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری طبیعت کیوں متلا رہی ہے۔ اس کا ایک سبب کانٹ تھا تو دوسرا سیاہ قہوے کی وہ تین پیالیاں جو میں اتنی دیر میں پی چکی تھی۔ میں ہمیشہ یہ بات بھول جاتی ہوں کہ مغرب میں ہر چیز مثال کے طور پر قہوہ مراکش سے کہیں زیادہ تیز ہوتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اپنے اختلاج قلب کے لیے مجھے کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ فرانس میں دل کا دورہ

اگر پڑ گیا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ میں رباط کے قریب

تمارا کے ساحل پر دفن ہونا پسند کروں گی۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ نہ تو میں نے اپنی وصیت لکھی ہے اور نہ اپنے لیے لوحِ مزار خریدی ہے جیسا کہ ہمارے فیض کی روایت ہے۔ میرے پاس صرف ''مارکو۔ اسسٹنٹس' کا انشورنس تھا۔ جس کے تحت یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ اگر میں عیسائی دنیا میں ختم ہو جاؤں تو وہ میرا تابوت میرے شہر پہنچا دیں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا' مجھے اتنے پریشان کن خیالات کو فوراً جھٹک دینا چاہیے لیکن اس دوران دادی یاسمینہ کے کہنے کے مطابق ''ایک عورت کو آسان ترین مسائل کے حل سے کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ وہ کام جن پر تمہارا بس ہے پہلے ان سے نمٹو۔'' چنانچہ میں نے فوراً سنگترے کی Pressee منگوائی اور ابھی اس سے لطف اندوز ہونا شروع ہی کیا تھا کہ جیکوئس آ پہنچا۔

ہماری پہلی منزل Musee du Louvre تھی۔ جہاں جیکوئس کی پرانی کنیزیں قیام کرتی ہیں۔ اور ہماری دوسری منزل Musee du Center Pompidou تھی جو اس کی نوجوان کنیزوں کا گھر ہے''میں ماضی کے خلفا کی طرح خوش نصیب نہیں ہوں جو اپنی تمام محبوب و مطلوب کنیزوں کو ایک ہی حرم میں رکھ سکتے تھے'' جیکوئس نے کہا'' پیرس میں ایک آدمی مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے حرم کو یکجا دیکھنے کے لیے پابندی سے یکے بعد دیگرے مختلف میوزیم کا رخ کرے۔''

لوور میں قدم رکھنے سے پہلے جیکوئس نے اپنی شوخ رنگوں والی کنزوٹائی کی جگہ ایک بڑی اور گہرے رنگ کی بوٹائی لگالی۔ ''ایک مرد جب اپنے حرم میں داخل ہو تو اسے نہایت باوقار اور طرح دار نظر آنا چاہیے۔'' اور پھر وہ شاہانہ انداز میں میوزیم کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

(7)

جیکوئس کا بے پردہ حرم اور خاموش حسینائیں

لوور میں داخل ہوتے ہی جیکوئس بہت سنجیدہ ہو گیا اور اس نے کہا کہ اب ہمیں اس کے حرم کے مقدس آداب برتنے ہوں گے۔ سب سے پہلے میں اپنے حرم کے حمام میں قدم رکھتا ہوں تاکہ اپنی تمام حسیناؤں کو ایک جگہ دیکھ سکوں۔ اس طرح یہ آسان ہو جاتا ہے کہ میں ان کی گنتی کروں اور اس بات کا یقین کر لوں کہ ان میں سے کوئی فرار تو نہیں ہوئی ہے اور پھر میں اپنی محبوب بیگم کے حضور حاضری دیتا ہوں اور ہم دونوں کسی اور کی مداخلت کے بغیر ایک دوسرے کو سراہتے ہیں۔''

اس جملے سے مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے بہت سے سوالات کرنے کی اجازت نہیں تھی تاکہ میں اس کے خوابوں میں خلل نہ ڈال سکوں' چنانچہ میں خاموشی سے اس کی رہنمائی میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اوپر پہنچ کر وہ جین۔ آگسٹے ڈومینکے انگریس کی پینٹنگ ''ٹرکش باتھ'' کے سامنے خاموش اور مبہوت کھڑا ہو گیا۔ اس پینٹنگ میں بیس سے زیادہ بے لباس کنیزیں 1862ء سے اب تک ایک محل کے تالاب میں ایک دوسرے پر پانی اچھال رہی تھیں۔ پینٹنگ کا یہ پُرسکون اور آسودہ ماحول مجھے کچھ آشنا سا محسوس ہوا۔ مجھے اپنے شہر کے وہ حمام یا عوامی غسل خانے یاد آئے جہاں کا رخ میں اپنی ریسرچ اور علمی مسائل کو فراموش کرنے کے لیے کرتی ہوں۔ انگریس جس نے مشرق کی سرحدوں کے اندر کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ ان حماموں کی

سب سے اہم خصوصیت کی عکاسی کرنے میں کامیاب رہا
تھا۔ وہ سادہ اور خالص شہوانیت جو لباس اتارنے کے بعد ایک گرم اور کہر آلود کمرے میں آسودہ ہوتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔

ایک زمانے میں حمام مسلم دنیا اور خاص طور سے قرون وسطیٰ کے بغداد میں خوب پروان چڑھے۔ گیارہویں صدی میں ہلال السابی نے جو کہ ایک عالم تھا کوشش کی کہ شہر میں حماموں کی تعداد معلوم کر سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جب لوگوں سے سوالات کیے تو ان کی ناقابل یقین تعداد کے بارے میں سن کر حیران رہ گیا۔ اس نے لکھا کہ مجھے بتایا گیا کہ ان حماموں کی تعداد دو لاکھ یا شاید اس سے بھی زیادہ تھی اور یہ طبقہ اعلیٰ اور عوام الناس دونوں کی رائے تھی۔ کچھ کا کہنا تھا کہ حماموں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تھی جبکہ کچھ دوسرے ایک لاکھ بیس ہزار بتاتے تھے۔ آخر کار بہت تحقیق اور حساب کتاب کے بعد اس نے 60 ہزار کا تعین کیا۔(1)

مسلم اور عیسائی ثقافت میں جو ایک بہت بنیادی فرق ہے وہ یہ کہ مسلمان اپنے بدن کی صفائی کو ایک شہوانی رسم میں بدل دیتے ہیں۔ کسی حمام میں اپنی تھکی ہوئی جلد کا گھنٹوں مساج اور پھر اس پر جڑی بوٹیوں کی خوشبو میں بسی ہوئی مٹی کا لیپ کرتے ہوئے نہانا خود اپنی ناز برداری کا وہ معاملہ ہے جس کا مغرب کے سوانا سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا تجربہ مجھے سویڈن کے شہر اسٹاک ہالم میں ہوا تھا۔ وہاں میں خوشبو میں بسی ہوئی مٹی کے استعمال کی جرأت بھی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ وہ جگہ کسی اسپتال کے سرجیکل وارڈ کی طرح صاف شفاف تھی۔

ابتداء سے عیسائیت نے غسل کو ایک شہوت انگیز گناہ تصور کیا ”انہیں کیا کہا جائے جو گناہ پر آمادہ کرنے والے حماموں کا رخ کرتے ہیں اور اپنی متجسس آنکھوں سے ان جسموں کی نظارہ بازی کرتے ہیں جو عصمت وعفت کیلئے مخصوص ہیں“ یہ جملے 200 عیسوی میں سیریان نے خبردار کرتے ہوئے لکھے جو کارتھیج کا بشپ تھا۔ ”ایسا غسل آلودہ کرتا ہے‘ یہ بدن کو نہ صاف کرتا ہے اور نہ اس کی طہارت کرتا ہے۔ یہ انہیں داغ دار کر دیتا ہے۔“(2)

یہ درست ہے کہ سیریان کے زمانے میں عوامی
حماموں میں مرد اور عورتیں ایک ساتھ جاتے تھے جو کہ رومیوں کی روایت تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ''حمام بہتر قسم کے کوٹھوں میں بدل گئے تھے۔''(3) لیکن مسلم ثقافت کے تحت اس نوعیت کے شہوت انگیز فضا کا عوامی حماموں میں کوئی تصور نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ثقافت میں ابتداء سے ہی دونوں صنفوں کے درمیان علیحدگی کا اصول بہت سختی سے رائج تھا۔ قرون وسطیٰ کے بغداد میں ہر دو صنف کے حمام الگ تھے اور وہاں ایک نرگسیت زدہ شہوانیت کے ساتھ اپنے بدن کو صاف کرنے پر زور تھا جس میں کسی دوسرے کی طرف دیکھنے کی گنجائش نہ تھی۔

الف لیلہ ولیلہ میں ہمیں غسل کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ اور عموماً غسل کسی اہم کام سے پہلے جب زمان اور مکان کی نئی سرحدوں کو عبور کرنا مقصود ہو تو اس کام کی ابتدائی رسوم کے طور پر کیا جاتا ہے۔ جب کوئی مسافر کسی نئے شہر میں داخل ہوتا ہے، جب کوئی عورت کسی نئے محل میں پہنچتی ہے یا کوئی نوجوان ایک پرمسرت اور لذت آگیں رات کا آغاز کرنے والا ہوتا ہے تو یہ تمام کام حمام کے سفر سے شروع ہوتے ہیں۔ عیسائی ثقافت میں غسل کو بدن کی صفائی سمجھنا قطعاً ناپید ہے۔ اس لیے اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ بہت سے مغربی مصور حمام کے مناظر کی طرف کھنچے ہوں کیونکہ وہ اسے مشرق سے وابستہ شہوانی تخیل سمجھتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کے زمانے تک مغربی اقوام نے غسل کے خالص صفائی پر مبنی تصور کو دریافت ہی نہیں کیا تھا۔ فرنانڈو ہنریکوئس نے اپنی کتاب Prostitution and Society میں لکھا ہے کہ ''یورپ کے پاس تاریک دور کا جو بھی ورثہ تھا اس میں بدن کی صفائی اور طہارت شامل نہیں تھی۔ صلیبی جنگوں کے بعد ہی یورپ نے مشرق کے حمام کا تصور اختیار کیا اور عوامی سطح پر بدن کی صفائی کے معاملے کو سراہنا شروع کیا۔''(4)۔ اس بات سے آگاہ ہونے کے باوجود کئی صدیوں تک مغربیوں کا حمام سے خوف برقرار رہا۔ مورخ نوربراٹ الیاس اس خوف کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مغرب والوں کو یہ خوف تھا کہ حمام سے کہیں چھوت کی وہ بیماریاں نہ پھیل جائیں جو

وسطی دور کے یورپ کو ہلکان کیے رہی تھیں۔ وہ لکھتا ہے

کہ ''یہ تصور کہ پانی خطرناک ہے نسل در نسل منتقل ہوتا رہا' اس کا نتیجہ تھا کہ ہمیں اگر غسل یا منہ ہاتھ دھونے سے کراہت نہیں تو اس کم شکوک وشبہات کا رویہ ضرور ملتا ہے۔''(5) یہی وجہ ہے کہ مغربی ذہن میں غسل سے لطف اندوز ہونا ایک طویل مدت تک گناہ آلودہ جنسی عمل یا تباہ وبرباد کردینے والی وباؤں کے خطرات سے جوڑ کر دیکھا جاتا رہا۔

پہلی نظر میں انگریس کی Turkish Bath مجھے ''معمول کے مطابق'' دکھائی دی۔ کیونکہ اس پینٹنگ میں نظر آنے والی بیشتر عورتیں ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں جو کہ مشرقی حمام کا ایک عمومی رویہ ہے۔ ہم مسلمان عورتیں حمام کا رخ اس لیے نہیں کرتیں کہ اپنے برابر بیٹھی ہوئی کسی عورت کو دیکھیں' میں خود بھی اسے پسند نہیں کرتی کہ ادھر ادھر نگاہیں دوڑاؤں اور دیکھوں کہ میری قریب کون بیٹھی ہے۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ اس کا زیادہ امکان ہے کہ میری مڈبھیڑ یونیورسٹی کی اپنی کسی ساتھی ہم کار' کسی طالبہ یا جہاں میں رہتی ہوں اس بلڈنگ کے جمعدار کی بیوی سے ہوجائے۔ رباط کے حماموں کا یہ اصول ہے کہ آپ کو اپنے بدن کی مردہ کھال اور میل کو ایک کھردرے کپڑے سے رگڑ کر نکالنا ہے۔ آپ اپنے ساتھ جو تیل لے گئی ہیں اسے خوشبودار مٹی (جو غاسول کہلاتی ہے) میں ملا کر بدن پر ملنا ہے اور پھر مہندی کی ایک ہلکی سی تہہ لگانی ہے تاکہ بدن کی رنگت کھل اٹھے۔ آپ کو اپنے برابر والی سے باتیں نہیں کرنی کیونکہ اس طرح آپ کی توجہ شہوانیت کی طرف سے بٹ جائے گی۔ اپنے آپ میں گم ہونے کا یہ ماحول انگریس کی Turkish Bath میں بھی پایا جاتا ہے۔ ہر کنیز اپنے نرگسیت زدہ افق پر کسی نامعلوم نکتے کو دیکھ رہی ہے اور ساری توجہ اپنی ذات پر مرکوز ہے۔ شاید اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ حمام میں عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ وقت اس لیے صرف کرتی ہیں کہ یہ وہ واحد جگہ ہے جہاں ان سے کھانا پیش کرنے یا کسی دوسرے کی خدمت کرنے کے لیے نہیں کہا جاتا۔ لیکن انگریس کی Turkish Bath میں جو چیز میری آنکھوں میں کھٹکی اور میرے لیے بالکل اجنبی تھی وہ یہ بات

تھی کہ اس میں دو عورتیں ہیجان انگیز انداز میں ایک
دوسرے سے لاڈ پیار کررہی تھیں۔ مراکش کے کسی حمام میں یہ بات ناممکنات میں سے ہے اور اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک عوامی جگہ ہوتی ہے جہاں عموماً درجنوں بچے شور مچاتے ہوئے کود پھاندرہے ہوتے ہیں۔ مراکش میں لذت اندوزی کسی ایسی محفوظ جگہ سے مخصوص ہے جسے خلوت خانہ کہہ لیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے دوسرے ہم وطنوں کی طرح میں بھی مغربی مردوں اور عورتوں کو سرِراہ بوس و کنار کرتے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں۔ وصل وقربت سرِعام کے معاملات نہیں، یہ ایک معجزہ ہے جس کی حفاظت خلوت میں کی جانی چاہیے۔ میں نے جیکوئس سے اپنے ان خیالات کا اظہار کیا جو اس وقت بھی انگریس کی بنائی ہوئی پینٹنگ کو دیکھنے میں محو تھا، تو اس نے کہا کہ جہاں تک خود اس کا تعلق ہے اسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ عورتیں حمام میں کیا کررہی ہیں۔ بشرطیکہ دوسرے مرد انہیں نہ تاک رہے ہوں۔'' فاطمہ تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جب میں اپنے حرم میں قدم رکھتا ہوں تو وہ عورتیں جو ایک دوسرے سے محو راز و نیاز ہیں وہ بھی تھم جاتی ہیں اور میری طرف متوجہ ہوجاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ پینٹنگ مجھے اس قدر مسرور کردیتی ہے۔

ہم دونوں جب Salle Denon جانے اور اس کی محبوب کنیز سے ملنے کے لیے سیڑھیاں اتر رہے تھے تو جیکوئس نے مجھے دوسری اہم خصوصیت سے آگاہ کیا۔'' مغربی مرد معاشیات کے معاملے میں مسلمان مردوں سے کہیں زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں'' جیکوئس نے کہا ''میرے حرم کے تمام اخراجات جمہوریہ فرانس ادا کرتی ہے، تم خود سوچو کہ اگر ان تمام برہنہ عورتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے میں انہیں اپنی تحویل میں رکھتا تو مجھے اس کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی اور اس پر مجھے جو ٹیکس ادا کرنے پڑتے وہ الگ ہوتے۔ یہاں یہ فرانسیسی جمہوریہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مہنگے میوزیم میں ان روغنی تصویروں کو رکھے، ان کی دیکھ بھال کرے تاکہ میں اپنے خوابوں کی دنیا میں بھٹکتا رہوں۔ مجھے صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ جب میں ان تنہا خواتین سے ملنے آؤں تو بوٹائی لگالوں، یہ نیم تاریکی میں میرے قدموں کی آہٹ کی منتظر رہتی

ہیں'' اس کی یہ بات سن کر میں خود کو ہنسنے سے باز نہ رکھ سکی
لیکن یہ ضرور ہے کہ میں نے اپنی آواز بلند نہ ہونے دی کیونکہ ہم جیکوئس کی محبوب کنیز کے حضور پہنچ چکے تھے۔ یہ انگریس کی بنائی ہوئی La Grande Odalisque تھی جو اس نے 1814ء میں مکمل کی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی مجھے یہ اندازہ ہوا کہ اسے تو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسے ان گنت مرتبہ شہوت انگیز حسن کے نمونے کے طور پر آرٹ کی کتابوں اور رسالوں کے سرورق کی زینت بنایا گیا ہے۔ جیکوئس نے مجھے بتایا کہ اس کے ''ناقابل بیان'' حسن کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی پڑھا' اس میں سب سے اعلیٰ بات نیو یارک یونیورسٹی میں فائن آرٹ پڑھانے والے امریکی پروفیسر رابرٹ روزن بلم نے کہی تھی۔ روزن بلم نے لکھا تھا کہ ''حرم کی ایک مثالی شخصیت جس کے پیروں کو کبھی حرکت نہیں کرنی پڑی جس کی وجہ سے ان پر نہ شکنیں پڑیں اور نہ وہ کبھی تھکے۔ اس کنیز کو شاید ہماری فرحت و مسرت کے لیے غیر فعال دکھایا گیا تھا۔ وہ دبیز گدوں پر نیم دراز ہے' ریشم' کتاں' فر اور پروں کے ڈھیر اسے چھو اور چھیڑ رہے ہیں''(6)

اتنا کہنے کے بعد جیکوئس خاموش ہو گیا' وہ اپنے خیالوں میں گم تھا اور آہستہ آہستہ اپنی بوٹائی کو سہلا رہا تھا۔ لیکن اس حسینہ کو داد دینے والا تنہا وہی نہیں تھا' وہاں درجن بھر دوسرے مرد تھے جن میں کئی سیاح بھی تھے اور وہ مختلف یورپی زبانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ La Grande Odalisque کے حسن کے قصیدے فنش سے لے کر کروشین زبانوں تک سب ہی پڑھے جا رہے تھے۔۔ اس کی جلد کی تابانی کو اس کمرے کی وسعت' نیم تاریکی اور اونچی چھت نے کچھ زیادہ ہی اجاگر کر دیا تھا۔ اپنے سر کی دستار اور ایک پر کے سوا جس سے وہ خود کو مورچھل کر رہی تھی اس کے بدن پر کچھ بھی نہ تھا۔ مصور نے اسے اس لمحے اپنے کینوس پر پشت سے گرفتار کیا تھا' جب اس نے کسی خطرے سے گھبرا کر اپنا سر ہولے سے گھمایا تھا۔ جیسے اس نے پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنی ہو۔ جیکوئس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا کہ اس کی برہنگی اور

چہرے پرخوفزدہ ہرنی کی سی کیفیت اس پینٹنگ کی سحر
ناک کشش کے رازوں میں سے ایک ہے۔

جیکوئس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ La Grande Odalishque سے ملاقات اس کی جنسی تربیت کے لذت انگیزی پرمبنی اہم ترین لمحے تھے۔اس نے کہا کہ اس کی نسل جب جوان ہورہی تھی اس کے لیے ایک جیتی جاگتی برہنہ عورت کو روزمرہ کی زندگی میں دیکھ لینا ایک ناممکن بات تھی۔آرٹ کی تاریخ پڑھائے جانے کے دوران ہی لڑکے اور نوجوان مرد بے لباس عورتوں کو پہلی مرتبہ دیکھ سکتے تھے۔

''میں گیارہ برس کا تھا جب ہمارے پڑوس کے کیتھولک اسکول کی میری استاد Soeur Beneidictine نے ایک سہ پہر ہمیں ساتھ لے کر لوور کا رخ کیا۔اس نے شاید میری جنسی تحریک کا اندازہ کرلیا تھا تب ہی اس نے آہستہ سے کہا ''ننھے میاں' ان تصویروں کو اتنے غور سے نہ دیکھو۔''

لیکن میرے لیے اس کنیز کی برہنگی پریشان کن تھی میں نے جیکوئس کو بتایا کہ مسلمان حرم میں عورتیں برہنہ نہیں پھرتیں۔صرف وہی لوگ بے لباس گھومتے ہیں جن کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔حرم میں رہنے والی عورتیں ہر وقت مکمل لباس میں ہوتی ہیں اور اکثر وہ مردانہ لباس یعنی شلوار اور اونچی قمیص پہن لیتی ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ابتدائی زمانے کے وہ یورپی مرد جنہوں نے خوش بختی سے کسی سلطان کے دربار کی ایک جھلک دیکھ لی تھی وہ عورتوں کے نیم مردانہ' نیم زنانہ ہیولے دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے تھے۔Jean Thevenot کی مثال لیجئے' وہ یہ دیکھ کر گڑ بڑا گیا تھا کہ حرم کی عورتیں نقاب میں نہیں ہیں اور اس بات نے تو اسے ششدر کردیا تھا کہ وہ ''مردانہ لباس میں تھیں''۔اور اس نے تفصیل سے یہ بات لکھی تھی کہ حرم میں پہنی جانے والی شلواریں اور اونچی
قمیصوں میں پھرتی سے نقل وحرکت کتنی آسان تھی۔(7)

تھامس ڈالام جسے 1599 میں انگلستان سے

ایک بہت اہم مشن پر قسطنطینہ بھیجا گیا تھا وہ پہلا عیسائی تھا جس نے کسی ترک سلطان کے حرم کے بارے میں لکھا۔ وہ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے تعینات کیا گیا تھا کہ شاہ انگلستان نے ترک سلطان کو جو آرگن باجا تحفے کے طور پر بھیجا ہے وہ درست طور پر کام کرتا رہے۔ (8) ڈالام اگست کے مہینے میں قسطنطنیہ پہنچا اور سلطان نے ایک مہینے تک اسے روزانہ اپنی حرم سرا میں جانے کی اجازت دی تا کہ وہ موسیقی کے اس آلے کو نصب کر سکے۔ اسے اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ مردانہ حصے کی حدود سے آگے قدم رکھ سکے۔ اس کے باوجود ڈالام سلطان کی داشتاؤں کو اپنے محفوظ و مامون صحن میں ایک دوسرے سے کھیلتے اور اٹکھیلیاں کرتے دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ سب مردانہ لباس میں تھیں۔

''میں جب سلاخوں کے پاس پہنچا تو دیوار کی وبازت بہت تھی اور اس پر دونوں طرف سے لوہے کی بہت مضبوط سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ ان سلاخوں کے پیچھے سے میں نے اس عظیم الشان حرام سرا کی لگ بھگ تیس کنیزوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کے ساتھ گیند سے کھیل رہی تھیں۔ پہلی نظر میں مجھے گمان ہوا کہ یہ نوجوان لڑکے ہیں۔ لیکن جب میں نے ان کی پشت پر لمبے بال دیکھے جو چٹیا کی صورت میں گندھے ہوئے تھے اور جن کے آخر میں موتیوں کی لڑی بندھی ہوئی تھی اور بعض دوسری نشانیوں سے میں سمجھا کہ یہ عورتیں ہیں اور یقیناً بہت حسین'' (9)

حرم کی ان بتدائی جھلکیوں اور ان پر مغربی مردوں کے ردعمل سے میں اس نتیجے پر پہنچی کہ مغرب میں مرد فیشن کے طور طریقوں کے ذریعے عورتوں سے اپنے فاصلے کا تعین کرتے ہیں اور یہ

لباس ہے جس کے ذریعے وہ اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مشرق یعنی مراکش جیسے ملکوں میں عورتیں اور مرد آج بھی شام ڈھلے روایتی لباس پہنتے ہیں۔ (مغربی لباس کا تعین کام کے حوالے سے ہوتا ہے) عورتوں اور مردوں کے جلابہ میں فرق اس پر بنے ہوئے

نمونوں اور رنگوں کا ہوتا ہے۔ میں نے جب یہ بات
جیکوئس کو بتائی تو اس نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ہم پر دونوں تہذیبوں کے درمیان پائے جانے والے فرق کا اچانک ہی انکشاف ہوا ہے۔

''میں اپنے حرم میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ میری عورتیں مکمل طور سے بے لباس ہوں بالکل انگریس کی Grande کی طرح'' اس نے بہت پُرتکلف لہجے میں کہا جو کسی بھی قسم کے اخلاقی پہلو کو چھپا رہا تھا۔'' برہنہ اور خاموش' میری حرم کی عورتوں کے یہ دو بنیادی وصف ہیں''۔

''یہ بہت عجیب اور بے ڈھب بات ہے۔'' آخرکار میں نے ہمت کی کہ تنقید کرسکوں لیکن وہ بھی اس وقت جب ہم Salle Denon سے رخصت ہوکر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔'' مسلمان مرد اپنی عورتوں کو نقاب پہنا کر اور اگر انہوں نے مناسب لباس نہ پہنا ہو تو گلی میں انہیں ہراساں کرکے اپنی طاقت اور مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جبکہ تمہاری طرح مغربی مرد اپنی عورتوں کو بے لباس کرکے نہایت مسرت محسوس کرتے ہیں۔''

جیکوئس کا کہنا تھا کہ اس بات کو اس نے اب سے پہلے اس زاویۂ نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ تاہم اس نے اس بات سے اتفاق کیا کہ برہنگی اور لباس کا معاملہ مشرق و مغرب کے مردوں کے درمیان حسن اور لذت کے حوالے سے ان کے خیالات کے مختلف ہونے کا اشارہ دیتا ہے۔ پھر اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا'' ویسے ایک بات ضرور ہے کہ میری کنیز اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی اگر میں اسے اس کے لباس سے محروم کردوں۔ مجھے دروازے پر تالا ڈالنے کی

ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اگر میں اس بات کو یقینی بنادوں کہ وہ مکمل طور پر برہنہ ہے تو وہ کمرے سے باہر قدم رکھنے کی جرأت ہی نہیں کرے گی۔''

ہم جب کار میں Le Centre GeorgesPompidou کی جانب جارہے تھے

تا کہ اس کی محبوب کنیزوں میں آخری کنیز کو دیکھ سکیں جو Musee National d Art Moderne میں رہتی ہے۔تو اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ ''عورتوں کو ان کے لباس سے محروم کر دینا پیرس جیسے شہر میں حرم رکھنے کے اخراجات کو بہت کم کر دیتا ہے۔''

ہم جب جیکوئس کے حرم کی آخری کنیز یعنی ماتیس کی Odalisque a la Culotte rouge (سرخ شلوار میں کنیز) کے قریب پہنچے تو اسے ایک بار پھر چپ لگ گئی۔''انگریس کے بعد یہ میری دوسری محبوب کنیز ہے۔''اس پینٹنگ کے سامنے وہ یوں کھڑا رہا جیسے اس پر جادو کر دیا گیا ہو اور پھر سرگوشی میں یہ بات مجھ سے کہی اس کے بعد وہ اس کے سامنے تعظیماً جھکا اور مڑا تو اس کی نظر ان سیاحوں کے ہجوم پر پڑی جو ہمارے اردگرد تھے اور اس کے لطف و انبساط کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔لیکن میرا دل اس بے چاری کنیز کے لیے اداس ہو گیا۔اس کے کولہوں پر ایک ڈھیلے ڈھالے تنگ مہری کے زنانہ پاجامے اور شیفون کی ایک قمیص کے سوا کچھ نہ تھا۔جو آگے سے کھلی ہوئی تھی اور اس کا سینہ جھانک رہا تھا۔وہ ایک توشک پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے دونوں بازو سر کے نیچے تھے۔اس کے اردگرد آرائشی پردے لٹک رہے تھے۔ان کے درمیان وہ بالکل برہنہ سی نظر آ رہی تھی، وہ اداس اور تنہا تھی اور اپنے خیالوں میں گم۔

میں نے جیکوئس سے کہا کہ میں اسے حسین نہیں کہوں گی کیونکہ وہ بہت گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔اس نے میری بات سے اتفاق کیا کہ اس کی بے حد غیر محفوظ نظر آنے کی کیفیت میں کوئی بہت عجیب بات تھی۔

وہ بڑبڑایا ''شاید مجھ ایسے غیر محفوظ مرد اسی لیے اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ہمارے جذبات اس قدر پراسرار ہیں۔'' پھر وہ کہنے لگا کہ ماتیس کی بنائی ہوئی مختلف پینٹنگز میں سے اسے اپنی محبوب کنیز کے طور پر منتخب کرنے میں اسے خاصا وقت لگا تھا۔کچھ دنوں کے لیے اسے یہ خیال ہوا تھا کہ ایک دوسرے پیریسیان پیلس Musee del Orangerie میں اس آرٹسٹ کی

Odalisque a la culotte grise جو کہ زیادہ دور
بھی نہیں تھی' ہلاکت خیز حد تک زیادہ دل ربا تھی۔ جیکوئس نے شرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ
جب وہ نوخیز نوجوان تھا اسکا دل (Odalisque with Raised Arms (1923 پر آیا ہوا
تھا۔ یہ پینٹنگ اب واشنگٹن ڈی سی کی نیشنل گیلری آف آرٹ میں آویزاں ہے۔

''ماتیس کے پاس شاید زنانہ پاجاموں کی کمی ہوگئی تھی جب اس نے کنیز پر کام شروع
کیا،'' جیکوئس نے باتیں کرتے ہوئے کہا'' کیونکہ اس کے بھاری کولہوں پر شفاف شیفون کے
سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ایسی خواب ناک کیفیت ہے کہ جی چاہتا ہے
اسے بیدار کر دیا جائے۔'' جیکوئس نے بتایا کہ ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب اس نے یہ سوچا کہ وہ
اپنے حرم کو مکمل طور پر بدل دے اور وہ بھی پکاسو سے۔ میں اس سے یہ سن کر حیران رہ گئی اور
میں نے اعتراف کیا کہ میں نے اب تک یہ نہیں سنا تھا کہ پکاسو نے بھی کنیزوں اور حرم کو مصور کیا
ہے۔ جیکوئس نے بتایا کہ جدیدیوں کی کنیزیں متشدد جنس سے ابل رہی تھیں'' پکاسو نے 14 حرم
پینٹ کیے اور 1954ء کے اختتام سے 1955ء کی ابتداء میں متعدد اسکیچ بنائے۔'' اس نے بتایا
کہ'' یہ تصویریں Delacroixs کی متنوع تصویروں کے نام سے جانی جاتی ہیں۔''(10)

ہم کمرے سے نکلنے ہی والے تھے کہ میری نظر 1921ء کے سنہ پر پڑی جب
Odalisque with Red Trousers مکمل ہوئی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں صوفیا
کے کہنے کے مطابق بجلی سی چمکی۔ مسلم تاریخ میں اس سال کی بہت اہمیت ہے۔ یہی وہ سال ہے
جب قومی آزادی کی جدوجہد کے ایک قدم کے طور پر ترکی میں مسلمان عورتوں کی آزادی کا
اعلان ہوا تھا۔ 1920ء کی دہائی میں جب ماتیس ترک عورتوں کو حرم کی کنیزوں کے طور پر پینٹ
کر رہا تھا۔ عین اسی وقت کمال اتاترک نے عورتوں سے متعلق ان قوانین کا اعلان کیا تھا
جنہوں نے ترک عورت کو تعلیم' ووٹ ڈالنے اور سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کا حق تفویض کیا

تھا۔ ان ہی قوانین کا نتیجہ تھا جنھوں نے پوری مسلم دنیا کو

بدل کر رکھ دیا۔ ترک پارلیمنٹ نے 1935ء میں 17 عورتوں کو منتخب کیا۔ ترکی جس پر اب تک ایک با اثر اور طاقتور عثمانیہ سلطنت کی حکمرانی رہی تھی۔ اسی ترکی میں پہلی مرتبہ ایک نمائندہ حکومت جمہوری طور سے منتخب ہوئی تھی۔

1920ء کی پوری دہائی میں ترکی میں ''ینگ ٹرکس'' نامی تحریک نے وہ انقلابی جدوجہد کی جو ان تین چیزوں کے خلاف تھی' یہ تینوں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں۔ یہ تین چیزیں مطلق العنانیت' صنفی امتیاز اور نوآبادیاتی نظام تھیں۔ ''ینگ ٹرکس'' جس کی قیادت کمال اتاترک نے کی۔ اس نے الزام لگایا کہ سلطان کی مطلق العنان طرز حکمرانی مسلمانوں کے ''پچھڑے پن'' کا سبب ہے اور اسی کی وجہ سے مغربی طاقتوں کو ترکی پر قبضے کا موقع ملا ہے۔ ینگ ٹرکس نے حرم کے ادارے اور عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے کے معاملات پر شدید تنقید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جاہل مائیں' جاہل بیٹوں اور بیٹیوں کو ہی جنم دیں گی۔ 1929ء میں ینگ ٹرکس نے حرم پر پابندی عائد

کردی اور سلطان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی کنیزوں اور غلاموں کو آزاد کرے اور یوں وہ مسلم تاریخ کی پہلی جمہوریہ کے شہری ہوئے۔ ترکی کا وہ مجموعۂ قوانین جو 1926ء میں منظور ہوا۔ اس نے ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی لگادی اور طلاق اور بچے کو رکھنے کے حق کے حوالے سے عورتوں اور مردوں کو یکساں حقوق دیئے۔ کچھ ہی دنوں میں عورتوں کو ووٹ کا حق مل گیا۔ انہوں نے 1930ء کے بلدیاتی اور 1934ء کے قومی انتخابات میں حصہ لیا۔

Denitz Kandiyoti جو عورتوں کے موضوعات پر لکھنے کے حوالے سے ایک معروف ترک خاتون ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ ''کمال اتاترک نے پردے کے خلاف مہم چلائی اور عورتوں سے متعلق اصلاحات کو قومی تعمیر کی بنیادی حکمت عملی قرار دیا''(12)۔ Denitz Kandiyoti کا کہنا ہے کہ جمہوریت اور عورتوں کی آزادی کو نوآبادیاتی خاتمے کی بنیاد قرار دیا گیا اور یہ لہر ساری

مسلم دنیا میں پھیل گئی۔ مراکش سے پاکستان تک عورتوں

کی تعلیم اور دوسری اصلاحات کے حوالے سے مسلم دنیا میں بڑے پیمانے پر کوششیں شروع ہوگئیں۔ 1940ء میں مراکش میں لڑکیوں کے لیے پہلا اسکول قائم ہوا جس میں میری تعلیم ہوئی اور یہ بھی ترکی جیسی قومی تحریک کا نتیجہ تھا۔ اتاترک کی اصلاحات اور فوجی کامیابیاں' ترک علاقوں پر یورپی قبضے کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے میں کامیاب ہوئیں جس نے اسے بہت سارے لوگوں کی نظروں میں ہیرو بنادیا۔ چنانچہ 1920ء کی دہائی میں ماتیس نے جن اطاعت گذار ترک عورتوں کو پینٹ کیا وہ ترک سے زیاہ فرانسیسی ہیں جو محض ماتیس کے عالم خیال میں وجود رکھتی تھیں۔

میں نے جب اس پینٹنگ کو غور سے دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس فرانسیسی کی پینٹ کی ہوئی عورت حقیقت سے زیادہ با اثر ہے کیونکہ اتاترک کے 80 برس بعد بھی مغربی لوگوں کا خیال

ہے کہ مشرق میں کوئی چیز کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ انہیں یقین ہے کہ مسلمان مرد اور عورتیں اصلاحات کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھتے اور نہ جدید ہونے کی خواہش کرتے ہیں۔

Odalisque with Red Trousers پر لکھا ہوا۔ سنہ 1921ء میں دیکھتی رہی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری قوت گویائی سلب ہوگئی ہے۔ اس مغربی پینٹنگ میں ماتیس نے جو خیال پیش کیا تھا' وہ ترک عورتوں کو غلام بنائے رکھ سکتا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں ترک عورت اس وقت سیاست میں حصہ لے رہی تھی اور مختلف پیشوں سے وابستہ ہو رہی تھی۔ میں سوچتی رہی کہ کیا ایک تصور حقیقت سے زیادہ طاقتور اور با اثر ہوتا ہے۔؟ کیا حقیقت اس قدر نازک ہوتی ہے۔

یہ خیال کہ تصور ایک ہتھیار ہے جو وقت کو سمیٹ دیتا اور منجمد کر دیتا ہے اور حقیقت کو حقیر کر دیتا ہے۔ اس بات نے مجھے مضطرب کر دیا۔ اگر مغرب میں یہ طاقت ہے کہ وہ شبیہوں کے وسیلے سے وقت کی طنابیں کھینچ سکے تو پھر ہم کون ہیں جو اپنی شبیہوں کو خود اپنے قابو میں نہیں رکھ

سکتے؟ میں کون ہوں اور میری شبیہہ کون بناتا ہے؟۔ان
سوالوں کے جواب دینا ابھی میرے لیے ممکن نہ تھا اور بعض حیران کن سچائیوں کو ہضم کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دوں اور سارا دن شاندار دریائے سین کو تکنے میں گزار دوں۔ میں نے سوچا کہ یہ میرا حق ہے کہ میں ان پریشان کن خیالات کو بھول جاؤں اور اس احساس سے لطف اندوز ہوں کہ میں زندہ ہوں۔ بے شمار عورتیں ایسی ہیں جو خوش رہنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہیں کیونکہ وہ اپنی صورتحال کے تجزیے میں غرق ہو چکی ہیں۔

جیکوئس کے ساتھ گزرنے والی اس یادگار سہ پہر کو میں نے تین بہ ظاہر غیر متعلق چیزوں میں نظر نہ آنے والا ربط ڈھونڈ نکالا۔اور وہ تھا کانٹ کا ذہن سے عاری حسن کا تصور، پینٹ کی ہوئی شبیہوں کی قوت اور مغربی فلمیں۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ وہ تین بنیادی ہتھیار ہیں جو مغرب میں عورتوں پر تسلط کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور شبیہہ، عکس، تصویر، وقت کو منجمد کر دینے کا ایک طریقہ ہے۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حقیقتاً 1920ء میں ترک اور یورپی عورتیں خود کو آزاد کر رہی تھیں۔مغرب کے مصور یعنی ماتیس اور اس جیسے دوسروں کے قبضۂ قدرت میں وقت اور نسائی حسن دونوں چیزیں تھیں۔مشرق میں مرد عورتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ''مکان'' کو استعمال کرتے ہیں۔مثال کے طور امام خمینی جنھوں نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ گھر سے باہر حجاب میں نکلیں۔لیکن مغرب میں مرد عورتوں پر تسلط قائم کرنے کے لیے یہ طے کرتے ہیں کہ حسن کو کیسا ہونا چاہیے۔ وہ حسن کے جو معیار قائم کرتے ہیں اگر آپ ان پر پوری نہیں اترتیں تو یہ سمجھ لیں کہ آپ کی تقدیر پر مہر لگ گئی۔تو کیا یہ وہ بات ہے جو کمال اشاروں اور کنایوں میں مجھ سے کہہ رہا تھا کہ مغربی مرد، عورتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے مکان کے سوا کوئی اور چیز استعمال کرتے ہیں؟ کیا یوں ہے کہ مغرب میں عورتوں پر تسلط برقرار رکھنے کے لیے شبیہوں کے ذریعے وقت کو ہنر مندی اور چالاکی سے استعمال کیا جاتا ہے؟ دونوں ثقافتوں کے درمیان کیسا

عجیب تضاد ہے۔

چند دنوں بعد جب میں نے اپنے ان عجیب خیالات میں کرسٹین کو شریک کیا تو اس نے مجھے ایک ننھی سی کتاب دی اور کہا کہ یہ حسن کے بارے میں مغرب کے نظریے کو سمجھنے کے لیے اتنی ہی اہم ہے جتنا کانٹ کا نظریہ حسن۔ اس کتاب کا نام De Pictura تھا اور یہ 1435ء میں

Leon Battista Alberti نے لکھی تھی۔ کرسٹین نے بتایا کہ وہ رینے ساں کے دور سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے پینٹ کی ہوئی شبیہوں کو مغربی تمدن کی بنیادوں میں سے ایک قرار دیا اور وقت کو مسخر کرنے کی اس کی طاقت کو دریافت کیا۔ البرٹی نے لکھا کہ ''پینٹنگ ایک سچی الوہی قوت رکھتی ہے وہ نہ صرف غیر حاضر کو موجود کر لیتی ہے۔ (جیسے وہ دوستی کے بارے میں کہتے ہیں)۔ بلکہ وہ رفتگاں کو صدیوں بعد بھی زندہ رکھتی ہے۔'' (13) البرٹی کہتا ہے کہ سقراط اور افلاطون جیسے فلسفی، نیرو، ویلنٹینیا س اور الیگزینڈر سورس نے ''پینٹنگ میں کمال حاصل کیا۔(14) کرسٹین نے بتایا کہ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک اور مربوط اہم کڑی تھی جس کا البرٹی نے تعین کیا اور جو مغربی حرم کی چیستاں سے متعلق تھی اور وہ ایک شبیہہ کا مصور کیا جانا اور ایک قیمتی شے کا تخلیق ہونا۔ البرٹی لکھتا ہے کہ ''پینٹنگ واقعی ذہنی مسرت میں اور چیزوں کے حسن میں جو کردار ادا کرتی ہے اسے مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جس چیز کو بھی پینٹر کا برش چھولے اس کی قیمت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہاتھی دانت، جواہر اور اسی طرح کی دوسری قیمتی چیزیں مصور کی نظر کرم سے قیمتی تر ہو جاتی ہیں۔ سونے کو اگر پینٹنگ کا فن چھولے تو وہ سونے کی بہت زیادہ مقدار سے کہیں قیمتی ہو جاتا ہے۔''(15)

میں جب البرٹی کو پڑھ رہی تھی تو وہ تیسری بات جس نے مجھے چونکا دیا، وہ یہ تھی کہ یونان میں غلاموں کو مصوری کی ممانعت تھی۔ ''یونانیوں میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ آزاد پیدا ہونے والے، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ادب، جیومیٹری اور موسیقی کے ساتھ ہی فن مصوری کی تعلیم دی جاتی

تھی......مصوری کی عزت واحترام اتنا زیادہ تھا کہ یونانیوں
میں غلاموں کا یہ فن سیکھنا قانوناً ممنوع تھا۔(16)

میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ پینٹ کی ہوئی شبیہہ اور وقت میں وار مشین جیسا کوئی پوشیدہ تعلق نہ ہو۔لیکن اگر یہ تعلق تھا تو وہ معنی خیز مسکراہٹ جو مغربی لوگوں کے ہونٹوں پر''حرم'' کا لفظ سنتے ہی نمودار ہوجاتی ہے وہ زیادہ قابل فہم ہوجاتی ہے۔ چونکہ یہ مرد مصور' جو حسن کی شبیہہ پر اپنا قابو رکھتا ہے اس کے لیے اس کا حرم ایک محفوظ جگہ ہے جو برہنہ اور خاموش عورتوں سے بھرا ہوا ہے۔اگر حقیقت میں یہ عورتیں دماغ رکھتی ہیں اور ذہین ہیں تو اس سے اس وقت تک کوئی فرق نہیں پڑتا جب تک وہ اس بات کو چھپا سکتی ہیں۔ یہ کردار ادا کرنے اور تھیٹر جیسا معاملہ ہے' جیسے حجاب کا معاملہ۔ وہ جنونی جو افغانستان' الجیریا اور دوسری جگہوں پر عورتوں کو حجاب لینے پر مجبور کرتے ہیں' وہ عورتوں کی ذہانت کو رسوا اور تباہ نہیں کرتے۔اس کی بجائے یہ گھر سے باہر نکلنے اور اس میں حصہ داری کی لڑائی ہے۔ مردوں نے سڑکوں پر' پارلیمنٹ میں اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔عورتوں کو پردہ کرنا چاہیے تاکہ یہ بات نظر آسکے کہ یہ جگہیں ان کی نہیں ہیں۔حجاب کا معاملہ ایک سیاسی معاملہ ہے۔

حجاب پہننے والی عورت گلی میں قدم رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کرتی ہے کہ وہ گھر سے باہر کی دنیا میں محض ایک سایہ ہوگی۔ طاقت واقتدار اپنا اظہار تھیٹر کی طرح کرتے ہیں۔ جہاں طاقتور کمزور کو یہ حکم دیتا ہے کہ اسے لازماً کس نوعیت کا کردار ادا کرنا چاہیے۔بحیرۂ روم کے مسلم حصے میں حجاب لینے کا مطلب یہ ہے کہ امام کے حکم کے مطابق لباس پہنا جائے جبکہ بحیرۂ روم کے یورپی کنارے پر دلکش نظر آنے کے لیے عورت کو وہ لباس پہننا ہے جو بازار کے امام کا حکم ہے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ایک دلچسپ بات ہوسکتی ہے کہ مشرق اور مغرب کے مرد اور عورتیں اپنی اپنی ثقافت

اور کردار بدل لیں تاکہ دیکھا جاسکے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ مجھے سنجیدگی سے سوچنا چاہیے

کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک ٹریول ایجنسی کھول لوں تا کہ

دو ثقافتوں کے درمیان لوگوں کو لٹو کی طرح گھومنے کی سہولت فراہم کرسکوں۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے مجھے یہ بات یقینی طور پر معلوم ہونی چاہیے کہ میرا نظریہ درست ہے یا نہیں۔ ورنہ پہلے سال ہی میں دیوالیہ ہو جاؤں گی۔

میں نے خود سے سوال کیا لیکن یہ بات بھی مجھے کیسے معلوم ہوسکتی ہے۔ میرے خیال میں مجھے غیر ملکیوں پر سوالوں کی بوچھار کردینی چاہیے۔

ان عورتوں پر کیا گزرتی ہے جو مغرب میں مروجہ اصولوں کی پیروی نہیں کرتیں۔

وہ عورتیں جو کانٹ کی خاموش حسینہ کے کردار کی پیروی نہیں کرتیں۔ انہیں بدصورت کہا جائے گا یا شاید اس سے بھی زیادہ بری سزا دی جائے گی۔ ایڈگرایلن پو نے اگر شہرزاد کو قتل کردیا تو یہ بالکل منطقی بات تھی بلکہ شاید ایک عام سی بات۔ اگر ذہانت پر مردوں کی اجارہ داری ہے تو وہ عورتیں جو ذہانت کا مظاہرہ کریں گی انہیں ان کی نسائیت سے محروم کردیا جائے گا۔ واہ کیا مہذب اور کیا عیارانہ طریقہ ہے۔ کمال درست کہتا ہے ''مغربی مرد مسلمان مردوں سے کہیں زیادہ چالاک ہیں۔ اسے میدان جنگ میں خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس نوعیت کے خیالات نے مجھے دردسر میں مبتلا کردیا اور میری جیکوئس کے حرم کی سیر اچانک ختم ہوگئی۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے میرے ہوٹل کے دروازے پر چھوڑ دے۔ اسے میری ناسازی طبع کا افسوس تھا لیکن اس نے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا کہ میں اسے ہارون الرشید کے حرم سے متعارف کرواؤں گی۔

ہاں ضرور، لیکن قدرے آرام کرنے کے بعد۔ کل میں پودینے کی چائے اور خشخش کی تلاش میں اس طرف جاؤں گی جہاں بہت سے عرب تارکین وطن رہتے ہیں۔ مجھے اپنے شہر کے ذائقے کو چکھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔ میں دھوپ کے لیے اور سہ پہر کو پودینے کی چائے پینے کے لیے ترس رہی ہوں جب مسجد کے میناروں سے مؤذن دن کے خاتمے کا بے قراری سے اعلان

کررہے ہوں۔ شاید عرب تاریخ اور ہارون الرشید کے
بغداد کے بارے میں پڑھنا بھی میری مدد کرسکے۔

(8)

میراحرم: پرکشش خلیفہ ہارون الرشید

میں جب بھی حرم کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرا ذہن پہلے دو عرب شاہی خاندانوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ بنو امیہ (661-750) جن کا دارالسلطنت دمشق تھا اور بنو عباس (750-1258) جنہوں نے بغداد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

ان دونوں مسلمان سلطنتوں نے 11 ھجری (632ء) میں رسول کریمؐ کے وصال کے بعد حکومت کی (1)۔ حالانکہ ان دو ابتدائی سلطنتوں کا دور اقتدار 51 خلفاء پر مشتمل ہے۔ میرے ذہن میں ہمیشہ خلیفہ ہارون الرشید کا نام ابھرتا ہے۔(2)

نویں صدی عیسوی میں اس کے دور حکومت سے آج تک ہارون الرشید کا نام ان گنت عربوں کے تخیل کو بے دار کرتا رہا ہے۔ وہ الف لیلہ ولیلہ کی متعدد داستانوں کا کردار بنا جس کی وجہ اس میں سحر ناک خوبیوں کا اکٹھا ہوجانا تھا۔ اس کی وجاہت، نوجوانی، چستی اور پھرتیلا پن، ذہانت، علوم اور سائنسی معلومات کے حصول کے لیے اس کی وارفتگی اور اس کی کامیاب فتوحات۔ اس کے ساتھ ہی ہارون الرشید ایک بھری پری جذبات اور جنسی زندگی گزارتا نظر آتا ہے۔ وہ عشق

کرنے سے خوفزدہ نہ تھا۔ نہ اپنے جذبات کے اظہار سے یا ان والہانہ جذبات کی

شناوری سے جو عورتیں اس کے اندر بیدار کرتی تھیں۔

ہارون الرشید نے کئی بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایک مرد جب عشق میں گرفتار ہوتا ہے اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے تو وہ کمزور اور غیر محفوظ ہو جاتا ہے اور عورتوں کو اپنے قابو میں رکھنے کی صلاحیت کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اپنے ان جذبات کے اظہار کی صلاحیت اور عشق میں گرفتار ہونے کے بعد اپنی کمزوری کا اعتراف ہی ہارون کی تادیر قائم رہنے والی سحر نا کی کا ایک راز ہے۔ دوسروں کی طرح میں بھی اس بات سے خوف زدہ رہتی ہوں کہ میں کسی ایسے شخص سے محبت کا اظہار کر بیٹھوں جو میرے جذبات کی قطعاً قدر نہ کرتا ہو اور یوں میں خود اپنی نظروں میں کم ہو جاؤں۔ اسی لیے میں ہارون الرشید کو اس ہمت کی داد دیتی ہوں کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس خطرے سے نہیں گھبراتا تھا کہ کہیں اس کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ الف لیلہ ولیلہ کی کم سے کم ایک داستان ایسی ہے جس میں وہ ایک ایسے کم نصیب شوہر کی طرح سامنے آتا ہے جس کی جریہ (کنیز) اس کے اپنے موسیقار سے تعلقات قائم کر لیتی ہے۔

ہارون الرشید ایک ایرانی شہر رے میں 16 فروری 766ء (149ھ) کو پیدا ہوا۔ اس شہر کے کھنڈرات تہران کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ کسی تعلّی کے بغیر شاندار اور وجیہہ تھا۔ بحیرہ روم کے اس حصے میں جہاں میں رہتی ہوں یہ ایک نادر خوبی ہے۔ قرون وسطٰی کے مسلمان مورخ جو سب کے سب مرد ہیں وہ اس کی خوش طبعی کو جسمانی خصوصیات اور اس کی ذہنی صلاحیتوں کا متوازن آمیزہ قرار دیتے ہیں۔ ''الرشید کا رنگ بہت صاف تھا' وہ بالا قامت' شاندار' سحر ناک شخصیت کا مالک اور شیریں بیان تھا۔ وہ سائنسی علوم اور شعروادب پر یکساں گرفت

رکھتا تھا''۔(3) وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ذہنی مستعدی جسم کی چستی پر منحصر ہے اور دونوں کو کھیلوں اور مقابلوں میں حصہ لے کر بڑھانا چاہیے۔ ہارون الرشید پہلا خلیفہ تھا جس نے

چوگان بازی (پولو)۔ مقابلوں کے دوران تیز اندازی'
گیند اور ریکٹ کے مقابلوں کو عوام میں مقبول بنایا۔ وہ ان لوگوں کو انعامات دیتا تھا جو ورزش اور کھیلوں میں شاندار کامیابیاں حاصل کرتے' یہی وجہ ہے کہ کھیل عوام میں تیزی سے مقبول ہوئے۔ عباسی خلفاء میں سے وہ پہلا تھا جس نے شطرنج اور چوسر کھیلنا شروع کی۔ ان کھیلوں میں مہارت حاصل کرنے والے کھلاڑیوں کو وہ انعامات سے نوازتا اور وظیفے جاری کرتا اس کے دور کی شان وشوکت' دولت اور خوشحالی کا وہ عالم تھا کہ لوگ اس کے زمانہ حکومت کو ''شادی کی ضیافت'' کے دنوں سے تشبیہہ دیتے۔ (4)

ہارون الرشید اگر صرف وجیہ وشکیل' شطرنج کھیلنے والا شہزادہ ہوتا تو اسے بھلا دیا جاتا۔ اسے کوئی اہمیت نہ دی جاتی جس طرح آج کے بہت سے تیل کی دولت پر رنگین راتیں گزارنے والے بہت سے مرد بھلا دیئے جاتے ہیں۔ ان کے برخلاف ہارون' جانتا تھا کہ کب عیش و عشرت سے کنارہ کر کے کاروبار سلطنت میں مصروف ہوجائے۔ عرب تمدن کا ایک بنیادی اور اہم لفظ ''وسط'' ہے جس کے سادہ سے معنی یہ ہیں کہ دو انتہاؤں کے درمیان کا نکتہ۔ بچپن سے ہمیں اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ عقل اور جذبات کے درمیان توازن کس طرح قائم کریں۔ ہارون کی زندگی توازن کا شاہکار تھی۔ اپنی نہایت اعلیٰ دانشورانہ اور جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ''وہ نہایت ذمہ داری سے حج اور جہاد کے فرائض بھی انجام دیتا۔ عوامی فلاح وبہبود کے لیے اس نے کنویں' پیاؤ' مکہ کو جانے والے راستے پر چوکیاں بنوائیں...... اس نے سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔ نئے شہر آباد کیے۔ کئی شہروں کے گرد فصیلیں تعمیر کرائیں۔ اس کے علاوہ متعدد فوجی تعمیرات اس کے

دور میں ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بہت سی کاروان سرائے اور رباط بنوائے......''

(5)

مثالی حکمران وہ ہے جو اپنے لوگوں کے استحکام کو اولین ترجیح دے اور مشکلات کا شکار

لوگوں کی مدد کے لیے اگر اسے اپنی جیب سے خرچ کرنا
پڑے تو اس سے بھی نہ ہچکچائے۔ ہارون کے اصل دشمن عیسائی تھے۔''189ھ (810 عیسوی)
میں اس نے رومن ریاست کی قید میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو بھاری رقم دے کر آزاد کرایا
تا کہ ان کی حدود میں کوئی ایک مسلمان قیدی موجود نہ ہو۔''(6)۔لیکن اس کے باوجود نسلوں تک
اسے یاد نہ رکھا جاتا اگر اس کے ساتھ ہی اس نے رومن سلطنت پر حملہ نہ کیا ہوتا۔''190ھ میں
اس نے ہر قلعہ فتح کیا اور اپنی فوجیں رومن سلطنت میں دور تک پھیلا دیں۔'' (7) عیسائی
جارحیت کو لگام دینے کی بناء پر ہارون مسلمانوں کا مثالی رہنما بن گیا۔ رومن شہنشاہ نقفورس (
فغفور) نے جب ایک معاہدے کو توڑا اور بدعہدی کی تو ہارون نے اسے ایک خط لکھا جو آج بھی
عرب دنیا کے مسلمان بچوں کو کنڈر گارٹن میں پڑھایا جاتا ہے۔''شروع کرتا ہوں خدا کے نام
سے جو بہت مہربان اور رحم والا ہے۔خدا کے بندے امیر المومنین ہارون کی طرف سے رومی کتے'
فغفور کے نام: میں تیرے خط کو سمجھ گیا ہوں اور میرے پاس اس کا جواب موجود ہے۔تو اسے
سنے گا نہیں اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔'' (8) اور اس کے ساتھ ہی اس نے رومیوں کے خلاف
اپنی فوجیں روانہ کر دیں۔

الرشید نے رومی شہنشاہ کو غیظ وغضب سے بھرا ہوا خط اس لیے بھیجا کہ ہارون نے جب
بازنطین کو فتح کیا اس وقت ففغور کی ماں ملکہ ارینا(802-797) نے صلح کے ایک معاہدے پر
دستخط کیے تھے۔فغفور نے اپنی ماں کے کیے ہوئے اس صلح نامے کو یکسر رد کرتے ہوئے لکھا:''

رومیوں کے بادشاہ فغفور کی طرف سے عربوں کے بادشاہ ہارون الرشید کے نام: اس
عورت نے تمہیں' تمہارے باپ اور تمہارے بھائیوں کو بادشاہ کا درجہ دیا اور خود کو ایک عام عورت
سمجھا۔ میں تمہیں ایک دوسرا مقام دیتا ہوں اور تیاری کر رہا ہوں کہ تمہاری زمینوں اور تمہارے
شہروں پر حملہ کروں۔ بشرطیکہ تم وہ سب کچھ واپس کر دو جو اس عورت نے تمہیں (بطور خراج) دیا
تھا۔الوداع''۔ یہ خط خلیفہ کو پہنچا تو اس قدر برافروختہ ہوا کہ اس نے مسلمان لشکر کی قیادت خود

کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ تہیہ کیا کہ اس وقت تک واپس
نہیں آئے گا جب تک فغفور کو مکمل شکست نہ ہوجائے۔''الرشید دم لیے بغیر رومیوں کی سلطنت میں بڑھتا چلا گیا' قتل کرتا ہوا' لوٹ مار کرتا ہوا' قیدی بناتا ہوا' قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا ہوا اور تاخت وتاراج کرتا ہوا وہ قسطنطنیہ کو جانے والی تنگ سڑکوں تک جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر جو نظارہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ فغفور نے تمام پیڑ کٹوا کر سڑکوں پر ڈلوادیے ہیں اور انہیں آگ لگادی ہے۔...... پھر فغفور نے الرشید کو تحائف بھجوائے اور نہایت خاکساری اور تابعداری سے شکست تسلیم کی اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ٹیکس ادا کیا''۔(9)

لیکن اگر ہارون الرشید صرف ایک جنگجو ہوتا تو وہ لوگوں کے ذہنوں میں صدیوں تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ کب جنگ سے باز آجانا چاہیے اور کب زندگی کی راحتوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ جمالیاتی تسکین کے طریقوں کو پروان چڑھانا چاہیے۔ یہ وہ باتیں تھیں جنہوں نے اسے ہیرو بنادیا۔ وہ اس لیے بھی ہیرو سمجھا گیا کہ وہ نوجوان تھا (21 برس کا تھا جب وہ خلیفہ بنا اور 44 برس کی عمر میں اس جہان سے گزر گیا) وہ لذت اندوزی کے مختلف پہلوؤں سے دلچسپی رکھتا تھا اور ان کی تلاش سے خوفزدہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی زندگی کے ان رومانوی پہلوؤں کی
کئی جھلکیاں الف لیلہ ولیلہ کی کئی داستانوں میں محفوظ ہیں۔

16 برس کی عمر میں وہ پہلی مرتبہ جس عورت کے عشق میں گرفتار ہوا وہ اس کی عم زاد زبیدہ تھی جو خود بھی ایک مغرور شہزادی تھی اس نے فوراً ہی اس سے شادی کرلی۔ یہ شادی ایک عالی شان محل ''الخلد'' میں ہوئی جس کا مفہوم ''جنت'' ہے۔ اس عہد کے ایک محتاط مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ''ہر سمت سے لوگ اس شادی میں شرکت کے لیے آئے۔ اس موقع پر دولت کے انبار لوگوں میں تقسیم کیے گئے یہ داد و دہش اس سے پہلے عالم اسلام نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔'' (19)۔ مختلف وقائع نگاروں نے زبیدہ سے ہارون کے عشق کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل لکھی

ہے۔ زبیدہ جب تک اس کی عزیز ترین بیوی تھی اس
وقت تک اس نے زبیدہ پرانعام واکرام کی جو بارش کی اس کی بھی تفصیل ملتی ہے۔نویں صدی کے ایک وقائع نویس نے لکھا ہے کہ ''وہ پہلی تھی جسے سونے اور چاندی کے جڑاؤ برتنوں میں انواع واقسام کے کھانے پیش کیے جاتے تھے۔اس کے لیے نفیس ترین اورست رنگے ریشم سے لباس تیار ہوتا۔ یہ ریشم (وشی) کہلاتا تھا اور ایک لباس 50 ہزار دینار میں تیار ہوتا تھا۔ وہ پہلی تھی جس نے اپنے ذاتی محافظوں کا دستہ ترتیب دیا جو خواجہ سراؤں' کنیزوں اور باندیوں پر مشتمل تھا۔ یہ دستہ اس کی سواری کے دائیں بائیں چلتا۔اس کے احکامات کی تکمیل کرتا اور اس کے خطوط اور پیغامات متعلقہ لوگوں تک پہنچاتا۔ وہ پہلی تھی جس نے چاندی' آبنوس اور صندل کی لکڑی سے بنی ہوئی پالکیوں میں سفر کیا۔ ان پر سونے اور چاندی سے آرائش کی جاتی۔ وہ پہلی تھی جس نے جوتیوں پر قیمتی پتھروں کی ٹکائی کروائی اور عنبر اسود شمعوں کو استعمال کیا۔اس کے ایجاد کیے ہوئے فیشن عوام تک پھیل گئے۔''(11)

زبیدہ کی نخوت اور عیش وعشرت سے اس کی دل دادگی کے باوجود مسلمان مورخ اسے کبھی بھی عقل وفہم سے عاری نہیں لکھتے۔اس کے برعکس وہ ماحول کو بہتر بنانے اور مفاد عامہ کی تعمیرات میں اس کی دلچسپی کا خصوصی ذکر کرتے ہیں۔ یہ زبیدہ تھی جس نے بغداد سے مکہ تک سڑکیں بنوائیں اور ان راستوں پر پانی کی فراہمی کا اہتمام کیا تاکہ زائرین کا سفر آرام سے گزرے۔نوجوان ہارون نے ایک ایسی شہزادی کو اپنی شریک زندگی منتخب کیا جو صرف حسین ہی نہیں تھی سیاسی طور پر بھی سرگرم تھی اور لوگوں کو ہارون سے اسی بات کی توقع تھی۔

زبیدہ سے محبت کے باوجود ہارون الرشید جیسے ہی خاندان عباسیہ کا پانچواں خلیفہ ہوا۔اس نے اپنے آپ کو ساری دنیا کی منتخب کنیزوں کے ہجوم میں پایا۔ان کنیزوں کی صفات اوران کا حسن مورخوں کو پرجوش بنادیتا ہے۔ایک مورخ نے لکھا کہ ''ہارون لارشید کی 2000 کنیزیں تھیں ان میں کچھ موسیقی میں طاق تھیں......اور وہ زیورات سے آراستہ رہتی تھیں۔''(12)۔اس

وقت تک مسلمانوں سے اس بات کی توقع نہیں رکھی جاتی
تھی کہ وہ کسی دوسرے انسان کو غلام بنا کر رکھیں گے (حالانکہ بعد کے زمانوں میں انہوں نے ایسا ہی کیا) ان کنیزوں میں سے بیشتر غیر ملکی عورتیں تھیں جو نئے علاقوں کی فتوحات میں ہاتھ آئی تھیں۔ یہ مختلف علاقوں سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کی ہنر مندیاں بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔ وہ غیر ملکی کنیزیں جو گانے کی خواہشمند ہوتی تھیں۔ ان کی راہ بہت مشکل تھی۔ انہیں آواز کو سریلا بنانے کے ساتھ ہی موسیقی کے مختلف آلات بجانے میں بھی مہارت ہونی چاہیے تھی۔ اور پھر ان کے لیے عربی زبان اور اس کی مشکل گرامر میں طاق ہونا لازمی تھا۔ اس کے ساتھ ہی فضل جیسی مقامی گانے والی کی مسابقت کا مرحلہ بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فضل حسن کا مجسمہ تھی۔ اس نے عرب گانے والوں کے لیے جو معیار قائم کیا بعد کی صدیوں تک اس کی پیروی کی گئی۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ ''فضل کی رنگت زیتونی تھی' ادب میں
اسے مہارت تھی' گفتگو بہترین کرتی تھی اور اس میں کمال بذلہ سنجی تھی' اشعار کی ادائیگی نہایت درست کرتی تھی'' (13)۔ ایک دوسرا مورخ لکھتا ہے کہ فضل مکالمہ کرتے ہوئے اس تیزی سے شعر کہتی کہ اس کے مقابل حیران رہ جاتے اور اکثر وہ زبان کے کمالات دکھاتی۔ یہ وہ ہنر ہے جو آج بھی عرب ثقافت میں سراہا جاتا ہے۔ ''فضل خدا کی مخلوقات میں سے حسین ترین تھی' وہ نہایت اعلیٰ خطاط تھی اور معاملہ جب لفظوں کے چناؤ کا ہوتو فصاحت میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ مکالمہ کرنے میں بہترین تصور کی جاتی تھی اور کسی بحث میں مصروف ہوتی تو اس کی بات میں کوئی الجھاؤ نہ ہوتا'' (14)

عباسی دربار میں غیر ملکی ہونا کوئی خامی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تہذیب رنگا رنگی کو بڑھاوا دیتی تھی اور لوگوں کو اس بات پر انعام واکرام دیا جاتا تھا اگر وہ کئی زبانیں بول سکتے ہوں اور اپنے پس منظر کے تنوع اور اس کے حسن کو اپنی کارگزاری میں پیش کر سکتے ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت عباسیہ کے دور میں ''علماء' مصور' شاعر' ادیب' مختلف نوعیت کا نسلی پس منظر رکھتے

تھے۔ (آرامی، عربی، فارسی اور ترکی بولنے والے) رنگت
(گوری، سیاہ، گہری گندم گوں) اور مذہب (مسلمان، عیسائی، یہودی، صابی اور مجوسی) یہ بغداد کا وہ بین الاقوامی اور کثیر التہذیبی ماحول تھا جس نے اس کے اندر ایک عظیم تہذیبی مرکز ہونے کی قوت اور صلاحیت پیدا کی''(15) ۔ جمال الدین بن شیخ جو قرون وسطیٰ کی کتابوں میں دل لبھانے والے معاملات کی چھان بین کے جدید ماہر سمجھتے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گیارہویں صدی میں ایک اعلیٰ گلوکار کنیز کی قیمت تین ہزار دینار تھی جبکہ ابن زیدون جیسے مشہور شاعر کو 500 دینار کا وظیفہ ملتا تھا اور ایک راج مزدور ایک دن میں ایک درہم کما تا تھا۔ ایک درہم سے وہ تین سو روٹی خرید سکتا تھا۔''(16)

کوئی کنیز جس قدر چیزوں میں مہارت رکھتی تھی اور وہ اپنے آقا کو جس قدر زیادہ اور متنوع لطف اور لذت بہم پہنچا سکتی تھی وہ اتنی ہی قیمتی تھی۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو خلافت عباسیہ کی سنہرے دور میں پائی جاتی ہے۔ کنیزوں اور غلاموں کی تجارت کرنے والے جانتے تھے کہ کس خلیفہ کو کس وضع کی عورت سے تسکین ملے گی۔ ہارون الرشید کا بیٹا مامون جو اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''میں نے غلاموں کے ایک تاجر کو یہ کہتے سنا کہ المامون کو میں نے ایک کنیز دکھائی۔ وہ شعر گوئی میں طاق، فصیح، مہذب اور شطرنج کی عمدہ کھلاڑی تھی۔ میں نے اس کی قیمت ایک ہزار دینار بتائی تو مامون نے کہا کہ میں ایک مصرعہ کہتا ہوں اگر وہ اس کا دوسرا موزوں مصرعہ کہہ دے تو میں اس کی وہ قیمت ادا کر دوں گا جس کا تو طلب گار ہے اور اس کے سوا بھی تجھے دوں گا''(17)

خلیفہ مامون کو عورت کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں بہت لطف آتا تھا۔ وہ شطرنج اپنے ذہن کو صقیل کرنے اور جنگ کی تیاری کے لیے کھیلتا تھا۔ لیکن عورت کے ساتھ یہ کھیل کھیلتے ہوئے اسے کہیں زیادہ لطف و لذت کا احساس ہوتا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ اگر کھیلنے والے اپنے جسم اور روح کی یکجائی کے ساتھ کھیل رہے ہوں تو ذہنی مسابقت ہیجان کی بلندی کو چھو لیتی ہے۔

وہ اپنے مقابل سے یہ کہنے کی بجائے کہ ''آؤ ہم کھیل
شروع کرتے ہیں۔'' یہ کہنا زیادہ پسند کرتا تھا کہ ''آؤ۔ ہم ایک دوسرے کو بھینچ لیں۔''(18)۔
آج کے دور میں یہ ایک عام سی بات ہے کہ مقابلہ کرنے والے مقابلے سے لذت اندوز بھی
ہوتے ہیں۔ لیکن خلیفہ مامون کے زمانے میں ایسی کوئی بات کہنا لوگوں کو یقیناً چونکا دیتا ہوگا۔

14 ویں صدی کے ایک مصنف قائم الجوزی نے یہ معلوم کرنے کی مشقت کی کہ عربی میں ''مجھے تم سے محبت ہے'' کہنے کے لیے کتنے لفظ موجود ہیں۔ اس نے 60 لفظوں کی ایک فہرست تیار کی جنہیں اس نے اپنی کتاب ''روضۃ المحبین'' میں پیش کیا ہے۔ الجوزی نہایت اعلیٰ تجزیاتی ذہن رکھتا تھا۔ اس نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ کسی ایک کیفیت کا اظہار کرنے کے لیے اتنے بہت سے الفاظ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں پنہاں اشارہ یہ ہے کہ ''کوئی مسئلہ تھا''۔ پھر اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عرب عموماً یہ کوشش کرتے ہیں کہ مرکب خیالات وتصورات کے نام اتنی فراخ دلی سے رکھیں۔ مثال کے طور پر صرف وہ جنہیں سمجھنا مشکل ہو، جوان کے دل کو ناقابل اعتبار محسوس ہو۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ تاہم کسی ایک خیال کے بارے میں اتنے سارے الفاظ کا موجود ہونا مہذب ہونے کا مظہر بھی ہے۔ اس کی فہرست میں ایسے بہت سے لفظ تھے جو محبت کو ذہنی الجھن کے ایک خطرناک لمحے کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ یا ذہنی اختلال کے طور پر، ان الفاظ میں محبت کو خلا میں چھلانگ لگانے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے انگریزی میں "Fall in love" کہتے ہیں یا فرانسیسی میں Tomber Amoureux، اس کے علاوہ محبت کو دیوانگی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یا وحشیانہ اذیت سے۔ لیکن الجوزی کی اس فہرست سے مجھ پر جو دلچسپ انکشاف ہوا اور جس نے مجھے خوش کر دیا اور میری امیدوں کو تازہ کر دیا، وہ لفظ ہیں جن میں محبت کو مثبت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک خصوصی دوستی جس میں نرم دلی مکالمے کو آگے بڑھاتی ہے یا توانائی اور طاقت کی بجلی سی دوڑا دیتی ہے۔

صوفیوں کے یہاں عشق اور محبت ایک مرکزی
توانائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تصور عام
لوگوں میں یعنی آپ اور مجھ ایسے لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے جو کسی نوعیت کے روحانی معاملات نہیں رکھتے۔ ''ایک شخص اگر عشق میں گرفتار ہے تو وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر دے گا۔ جبکہ ماضی میں وہ اس سے انکار کر دیتا......اس کیفیت میں وہ اپنی تمام خوبیوں کا اظہار کرے گا اور خود کو اس طرح پیش کرے گا کہ دل اس کی طرف کھنچے''

یہ بات ابن حزم نے لکھی ہے جو گیارہویں صدی کا سیاستدان اور مذہبی قوانین کا ماہر تھا۔ اس نے جذبات کے اسرار کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ ''کتنی ہی مرتبہ کنجوس اپنی اشرفیوں کی تھیلی کا منہ کھول دے گا۔ ترش رو شخص کی پیشانی کے بل کھل جائیں گے۔ بزدل لڑائی دنگے میں بے خوف وخطر کود پڑے گا' کم عقل اچانک ذہانت کا مظاہرہ کرے گا اور غیر مہذب شریفانہ طور طریقوں کا اظہار کرے گا۔ جس کے کپڑوں سے بو آتی ہوگی وہ بنا ٹھنا نظر آئے گا۔ نحیف و ناتواں کو کھوئی ہوئی جوانی مل جائے گی۔ خدا رسیدہ پُرجوش ہوجائے گا۔ وہ جسے اپنی عزت بہت عزیز ہو وہ مارا مارا پھرے گا۔ یہ سب کچھ صرف عشق کی وجہ سے ہوتا ہے۔''(19)۔ ابن حزم کی ہر بات درست ہے۔ عشق آپ کے معمولات سے آپ کو ہٹا کر ایسے راستوں پر لے جاتا ہے جن پر چلنے کا آپ نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا اور اب ہم پھر اپنی فہرست کی طرف آتے ہیں۔ ان 60 لفظوں میں اکثر عشق کو ایک مجبور کر دینے والے سفر کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ نامعلوم کی طرف اٹھایا جانے والا قدم' نامعلوم اور اجنبی سرزمین پر مہم جوئی۔ اور اگر یہ مہم جوئی کسی عام آدمی کے لیے خطرناک ہے تو یہ خلفا کے لیے کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہارون الرشید نے کبھی بھی لطف اور عیش کو اتفاق پر نہیں چھوڑا۔ اس کے لیے منصوبہ بندی' حکمت عملی کے ساتھ اسے تقویم میں شامل کرنے کی ضرورت تھی۔

جذبات اور جنسی کشش انگیزی کی دنیا میں اس طرح قدم رکھا جائے کہ ہم احمق نظر نہ

آئیں اور ہمیں شرمندگی نہ ہو اس کے لیے لطف وسرور کو
ایک مقدس ترجیح قرار دے کر اس کے لیے وقت نکالنا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے مذہبی تہوار کے لیے وقت نکالا جاتا ہے۔ عیش وعشرت کو اپنی تقویم میں درج کرنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ دو ہفتے طویل کاروباری مصروفیات میں سے آرام کے دو دن نکالے جائیں۔ نہیں، اس کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا مطلب ترجیحات کو پہلے اور بعد میں کرنا ہے۔ اپنی تقویم پر آرام اور سکون کے دو ہفتے رکھے جائیں اور اس کے بعد اس میں کاروباری سفر کو جگہ دی جائے۔ میں نے کم سے کم ہارون الرشید کے بارے میں یہی پڑھا ہے کہ وہ اپنی ''مجلس''، یا ''عیش وعشرت کے لمحوں'' کی اسی طرح منصوبہ بندی کرتا تھا۔ وہ ان کو اسی طرح مرتب کرتا تھا جس طرح وہ جنگ کا نقشہ ترتیب دیتا یا مکہ کے مقدس سفر کی تفصیلات طے کرتا۔

(9)

مجلس آرائی: عیش وطرب ایک مقدس رواج

آپ بھرپور اور شدید حسی وابستگی کا لطف نہیں اٹھا سکتے' اگر ہر دس منٹ بعد آپ کی نظر اپنی گھڑی کی طرف اٹھتی ہو۔ یہ سبق میں نے ہارون الرشید کے بارے میں قرون وسطیٰ کی کتابیں پڑھتے ہوئے سیکھا۔ ایک مسلمان خلیفہ کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ انتہاؤں کے بیچ درمیانی راستہ اختیار کرے۔ دنیاوی ترغیبات اور روحانی بلندیوں کو چھو لینے کی خواہش' زندگی اور موت' لطف و انبساط اور جنگ کے درمیان ایک توازن۔ یہی وجہ ہے کہ ایک باکمال مجلس آرائی کی تیاریاں یوں ہونی چاہئیں جیسے میدان جنگ کا نقشہ ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کا منظر نامہ پہلے سے تیار ہونا چاہیے۔

اس کے کردار' اس مجلس کا موضوع' اس کے لوازمات سب سے پہلے اور نہایت احتیاط سے متعین ہونے چاہئیں۔

''مجلس'' کا لفظ ''جلسہ'' سے نکلا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ دیر بے حس وحرکت آرام سے بیٹھا جائے اور جس کا مقصد صرف لطف اندوز ہونا ہو۔ ''مجلس'' کا مطلب یہ ہے کہ چند لوگوں کی ایک ٹکڑی جن کی دلچسپیاں یکساں ہوں وہ کسی دل پذیر جگہ مثلاً کسی باغ یا چھت پر ایک دوسرے سے گپ شپ کے لیے جمع ہوں اور اچھا وقت ساتھ گذاریں۔ ''موسیقی کی مجلس کا

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اکٹھے ہونا جو موسیقی کو سنیں
اور اس کی مسابقانہ محفل میں حصہ لیں۔'' یہ بات George Dimitri Sawa نے لکھی ہے۔ جس نے اس موضوع پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔ ایسی محفلوں میں لوگ لطف اندوز ہونے کے لیے آتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی باتیں سنتے ہیں اور ''موسیقی' تاریخ' نظریات' انتقاد اور جمالیات کے موضوع پر ایک دوسرے سے مکالمے اور مباحثے کے ذریعے سیکھتے ہیں۔''(1)

خلفا کے دور میں درون خانہ ہونے والی مجلس ''نہایت آراستہ و پیراستہ ایوانوں میں منعقد ہوتی تھی۔ فرش اور دیواریں سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہوتے تھے یا انہیں ریشم' زربفت و کمخواب سے مزین کیا جاتا تھا جن پر سونے کے تاروں سے کام کیا ہوا ہوتا تھا۔ خلیفہ کا قدرے اونچا تخت قیمتی جواہرات سے مرصع ہوتا تھا۔ جبکہ تخت کے دائیں اور بائیں آبنوسی حاشیوں والے صوفے ہوتے جن پر حاضرین جلسہ اور موسیقار بیٹھتے۔''(2)۔ شراب کی فراوانی اور شباب کی موجودگی ان مجلسوں کے لطف وطلب کو بلندیوں تک پہنچا دیتی۔ ان کی کامیابی کی دلیل یہ ہوتی کہ وہ سارا دن اور ساری رات جاری رہتیں۔

اب جہاں تک شراب پینے کا سوال ہے تو اسلام نے (سورہ 5:91) میں اس کی ممانعت کی ہے۔ مسلمان بھی عیسائیوں' یہودیوں اور بدھ مت والوں کی طرح ہیں' انہیں معلوم ہے کہ کن باتوں کو گناہ کہا گیا ہے لیکن یہ لازم نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ مقدس احکامات کی تعمیل کریں۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ فرشتے کہلائیں گے۔ شراب چونکہ اسلام میں ممنوع ہے اس لیے یہ مسلمانوں کی نفسیات کا حصہ ہے کہ وہ اسے لطف وانبساط سے جوڑ کر دیکھتے ہیں اور یوں وہ اپنے بدن کے زوال اور ان گذرتے ہوئے لمحوں کا انتقام لیتے ہیں جو ہمیں مسلسل موت کے منہ کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ زمانہ قدیم سے مسلمان ملکوں میں الجزائر' مراکش اور تیونس نفیس اور خوش ذائقہ شرابوں کی کشید کے لیے مشہور ہیں۔ رومیوں کے اس علاقے پر صدیوں اپنا قبضہ برقرار رکھنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ آثار قدیمہ کو دریافت کرنے کی متعدد مہمیں جو بحیرہ روم

کے ساحلی علاقوں میں مصروف عمل ہیں وہ اکثر ان رومی
جہازوں کے ڈوبے ہوئے ڈھانچوں میں سے شمالی افریقہ کی شرابوں کے کنٹر اور زیتون کے تیل
کے پیپے نکالنے میں کامیاب ہوئی ہیں جنہیں اہل رومہ مال تجارت کی طرح لے جاتے تھے۔
اس کے علاوہ اس بات کے تاریخی شواہد ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بربری مراکش میں
شراب جی کھول کر پی جاتی تھی اور اس سے لطف لینے کا رواج تھا۔ بہ طورِ خاص بحیرہ روم کے شمالی
شہروں جیسے بادیس میں، محمد الاوزان جسے لیو افریکائی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے
سولہویں صدی کی اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ ''بحیرۂ روم کے کنارے بادیس ایک چھوٹا سا شہر
ہے۔ اس کی آبادی دو گروہوں میں تقسیم ہے۔ ان میں ایک گروہ مچھیروں کا ہے اور دوسرا
قزاقوں کا جو اپنی کشتیوں پر جا کر ساحلی عیسائی آبادیوں پر حملے کرتے ہیں۔ یہاں شہر میں
ایک اہم گلی ہے جس میں یہودی آباد ہیں جن سے نہایت خوش ذائقہ شراب خریدی
جاسکتی ہے۔ اس کے نفیس ہونے پر تمام بستی والوں کا اتفاق ہے۔ موسم جب بھی خوشگوار ہو، شہر
والے کشتیوں پر سمندر میں نکل جاتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور موسیقی کی محفلیں سجاتے ہیں۔''
(3)

سولہویں صدی میں ہی کم سے ایک مسلمان شہنشاہ ہندوستان کا جہانگیر ایسا تھا جو بلانوش
تھا۔ عمر خیام جس کی شاعری آج بھی مسلمان دنیا کے کئی حصوں میں گائی جاتی ہے۔ اس کی بیشتر
شاعری شراب کی تعریف و توصیف کے لیے مخصوص ہے جس کے اس نے انتہائی لطف ولذت
کے قصیدے پڑھے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ اس کی شاعری میں ایک زیریں لہر افسردگی کی بھی ملتی
ہے۔ اس کی شاعری میں شراب سے کشید کی جانے والی لذت ہمیں گذرتے ہوئے وقت اور
ہمارے گنے چنے دنوں کی عارضی دلکشی کا احساس دلاتی ہے۔ شراب کا عارضی خوشی اور زوال
پذیری سے جو فلسفیانہ تعلق ہے، وہ اس بات کی صراحت کرتا ہے۔ آج بھی خیام کی شاعری کو وہ
لوگ بھی گاتے ہیں جو شراب سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور وہ بھی جو اسے ہاتھ تک نہیں

لگاتے۔

غموں کو موقعہ نہ دو کہ وہ خوشی سے بھرے ہوئے دل کو پژمردہ کر دیں اور نہ دکھوں کے پتھر تمہاری خوشیوں کے موسم کو برباد کر دیں۔کوئی بھی مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

تمھیں بس شراب، محبوب اور دل کو مطلوب خواہشوں کی ضرورت ہے۔شراب کے سوا ہر چیز کم کم ہی اچھی ہے۔اور شراب دلربا حسینوں کے ہاتھوں سے''۔(4)

بحیرہ روم کے خوشگوار ساحلوں پر آباد کئی مسلمان ملکوں میں شراب کی طلب آج بھی اتنی زیادہ ہے کہ ٹیکسوں کی وجہ سے بڑھتی ہوئی قیمتوں نے بھی ان کی فروخت پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے ۔تاہم کوئی بھی یہ سوچ سکتا ہے کہ پرانے زمانے کے مسلمان حکمرانوں کا کیا احوال تھا؟ کیا وہ شراب

پیتے تھے؟ مورخین نے ان کی زندگی بہت تفصیل سے بیان کی ہے۔اسی لیے ہم جانتے ہیں کہ عرب خلفاء، ترک سلطان اور مغل شہنشاہ شراب کے رسیا تھے۔لیکن عرب حکمرانوں کی یہ بات غیر معمولی ہے کہ عموماً وہ اپنے لطف وانبساط کو''حجاب'' میں چھپا لیتے تھے جس کا لفظی مطلب''نقاب'' ہے۔نویں صدی کا میرا محبوب مصنف جاحظ جو اکثر وبیشتر عباسی دربار بہ طور خاص خلفاء کے حضور حاضر رہتا تھا۔جن میں ہارون بھی شامل ہے اس کا کہنا ہے کہ ہارون الرشید جب شراب پیتا تو وہ پردے کے پیچھے بیٹھتا تھا۔''اگر کوئی یہ کہتا کہ اس نے الرشید کو پانی کے سوا کچھ اور پیتے دیکھا ہے تو یقین کرو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' جاحظ نے لکھا ہے کہ''صرف اس کی محبوب کنیزوں نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے۔کبھی کبھی کوئی گیت اس کے دل کو چھو لیتا تو وہ کھل کر داد دیتا لیکن اس میں بھی حد سے نہ گزرتا۔''(5)

مجلس آرائیاں سخت ادب واحترام اور حدود کی پابندی کرتے ہوئے ہوتیں۔ جاحظ کہتا ہے کہ تاہم کوئی بہت پائے کی فنکار کنیز جو مرد شاعروں اور موسیقاروں کی ہم سری کرتی تھی۔وہ حدود وقیود اور آدابِ شاہی کو درہم برہم کر سکتی تھی، کیونکہ اس کا فن اس کی جنسی کشش کو کہیں سے

کہیں پہنچا دیتا۔ فتوحات کے بعد مال غنیمت میں بغداد
لائی جانے والی کنیزوں کے لیے یہ صورتحال بہت سے مواقع کے در کھولتی تھی۔ فنون لطیفہ اور سائنسی علوم میں مسابقت کے ذریعے نہ صرف ان کا سماجی رتبہ بلند ہوسکتا تھا بلکہ کنیزوں کے بازار میں ان کی قیمت بھی بہت بڑھ جاتی تھی اور وہی شاہی سلسلے کے مردوں کو مکمل طور پر بے اختیار کردیتی تھیں، مسلم دنیا میں غلاموں اور کنیزوں کے تاجر امیر ترین اور نہایت بااثر لوگ ہوتے تھے، ایک کنیز اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور پیشہ ورانہ مہارتوں کے سبب فیصلے کرنے پر قادر افراد کے اور اپنے درمیان فاصلے کم کرسکتی تھی۔

اور یہاں ہم حرم کے جال کے بارے میں اس بنیادی نکتے کو پالیتے ہیں جو پوشیدہ بھی ہے اور مہلک بھی۔ اپنی ایک کنیز کے عشق میں گرفتار ہوجانے والا مرد اپنی کنیز کا غلام ہوجاتا ہے۔ دانشورانہ اور پیشہ ورانہ مہارتوں سے آراستہ کنیز اپنے آقا کے ذہن اور محسوسات پر حکمران ہوجاتی ہے۔ اس طرح وہ کنیز بے پناہ اثر ورسوخ کی مالک ہوجاتی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ بچے کی ماں اور ام الولد ہوسکے۔ یہ وہ صلاحیت تھی جو ہر ایک کو قانونی حیثیت عطا کردیتی تھی۔ شدید جسمانی اور ذہنی تعلق کے ذریعے آقا کا دل موہ لینے کا مطلب اسے ناقابل بیان لذت سے ہمکنار کرنا تھا۔ جاحظ کا کہنا ہے کہ ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے کہ کوئی کنیز کسی مرد کو اس حد وانتہا کی لذتیں فراہم کرسکے۔'' جاحظ بلا کا بدصورت تھا اور دل گیری کے جادو کی گرہیں کھولنےمیں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اور یہی اس کی شہرت کا سبب تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ''لذتوں کی اس بے اندازہ برسات میں ایک سے کہیں زیادہ حسین ادائیں کام کررہی ہوتی ہیں اور یہ دل کو موہ لینے کا سب سے خطرناک طریقہ ہے اور اس کے سامنے ہتھیار ڈالے بنا نہیں بنتی۔'' (6)

یہ وہ دور تھا جب دونوں صنفوں کے درمیان آویزش پر اسی طرح قابو پایا جاتا تھا جس طرح دو تہذیبوں کے درمیان ہونے والے تنازعے پر۔ اس صورتحال میں عملی مقاومت کا خطرہ پایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود جو بھی یہ خطرہ مول لیتا، اس سے اس کی قدر اور خوبیوں میں اضافہ

ہوتا۔

عشق میں گرفتار ہونے کا مطلب مختلف نوعیت کے تجربے سے گذرنا ہے' اپنے آپ کو ان نامعلوم سنسنی خیزیوں اور جذبات سے دوچار کرنے کی ایسی جگہ پر دعوت دیتا ہے جہاں خوف اور بات کھل جانے کی خواہش مہلک طور پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔اس کھیل میں حصہ لینے والے کے پاس دو نہایت قیمتی اثاثے ہونے چاہیں' اس رشتے کو فراواں وقت دینے کی سہولت اور اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنا کہ خود کو دوسرے کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔ اس عہد کے مرد اگر کسی ذہین اور ہنر مند عورت سے ہنگامہ خیز شہوانی تعلق استوار کرنا چاہتے تھے تو ان کے اندر شعر کہنے کی صلاحیت ہونی لازمی تھی تا کہ اپنے جذبات کو شعر کے آہنگ اور بحر میں بیان کرسکیں۔ ہارون الرشید کی شاعری یقینی طور پر دوسرے درجے کی تھی' اس کے باوجود حیران کرنے والی بات یہ ہے کہ ایسی شاعری کرتے ہوئے اسے شرمندگی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

ہارون الرشید کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو بہ قول Roland Barthes ''لفظوں کو شہوانی رنگ میں استعمال'' کرتے ہیں۔''زبان کو جلد سمجھ کر' میں اپنی زبان کو' دوسرے کی زبان سے مس کرتا ہوں۔ یوں جیسے میرے پاس انگلیوں کی بجائے لفظ ہوں' یا میرے لفظوں کی پوروں پر انگلیاں اگی ہوئی ہوں۔''(7)

ہارون الرشید ہزاروں کنیزیں رکھتا تھا اور اکثر ان کے عشق میں گرفتار ہوتا رہتا تھا۔لیکن وہ اس کا قائل تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی عورت کا گرفتار ہونا چاہیے۔صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ یہ بہادر خلیفہ اکٹھے تین حسیناؤں کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔اس کا خصوصی نتیجہ فضول شاعری کی صورت میں نکلا۔

ہارون کی ان تین حسیناؤں کے نام''سحر''(جادو)''ضیا''(تابانی)'اور خُنث (نسائیت) تھے۔ان تینوں حسیناؤں کے ناموں پر اس نے اپنی زباں دانی کے ہنر ایک ساتھ آزمائے۔اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ملاحظہ کیجئے:۔

سحر، ضیا اور نخت، جادو، تابانی اور نسائیت ہیں۔ان
میں سے ایک نے میرا ایک تہائی دل چرایا
اور باقی کو دو لے بھاگیں۔ ان تینوں حسیناؤں نے میری لگام پکڑ کر مجھے چلایا۔ اور میرے دل کے ہر گوشے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ کیا یہ حیران کردینے والی بات نہیں کہ ساری دنیا میرا حکم مانتی ہے اور یہ عورتیں مجھ سے بغاوت پر آمادہ ہیں اور میں پھر بھی ان کے حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کرتا ہوں۔
یہ سب کچھ عشق کی طاقت کے سبب ممکن ہوا جس نے انہیں میری حکمرانی پر فوقیت دی۔(8)

خلیفہ جب یہ شعر کہہ چکا تو اس نے ایک موسیقار سے کہا کہ وہ ان اشعار کی موسیقی ترتیب دے اور آنے والی مجلس میں انہیں گا کر سنائے۔ لیکن ہارون اس بات کو ترجیح دیتا تھا کہ اپنی کسی تربیت یافتہ کنیز کے شعر اس کے لبوں سے سنے۔ اور میرے خیال میں وہ اپنی شاعرانہ محدودات سے بھی واقف تھا۔ اسی لیے وہ اپنی توجہ اسی بات پر مرکوز رکھتا تھا کہ ذاتی طور پر شاندار اور وجیہہ نظر آئے۔ اس لیے ہزاروں بیش قیمت قمیصیں اور عبائیں اکٹھی کرتا رہتا تھا۔ وہ کتنے ملبوسات اور ذاتی استعمال کی اشیاء کا مالک تھا۔ اس کا علم اس کی رعایا کو اس وقت ہوا جب اس کا انتقال ہوا۔ اس کی مسلمان رعایا اپنے بادشاہ کے اعلیٰ ذوق اور بے پناہ اسراف سے یقیناً حیران رہ گئی ہوگی۔ الفضل ابن الربی لکھتا ہے کہ:

''193ھ (809ء) میں جب محمد الامین اپنے باپ خلیفہ ہارون الرشید کی موت کے بعد تخت نشین ہوا تو اس نے مجھے حکم دیا کہ شاہی توشہ خانوں میں خلیفہ کے لباس، آرائشی سامان، ظرف وظروف اور آلات کی فہرست تیار کرو۔ میں نے متعلقہ افسران اور توشہ خانوں کے نگراں افراد کو طلب کیا اور خلیفہ کے خزانوں اور توشہ خانوں میں موجود سامان کی گنتی کا کام شروع کیا جس میں مہینوں صرف ہوگئے۔ اس کام کے دوران میں نے خلیفہ کے توشہ خانوں میں وہ سامان

اوراشیاء

دیکھیں جن کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔اس سامان کی فہرست کچھ یوں تھی۔ ''کڑھی ہوئی 4 ہزار عبائیں' 4 ہزار ریشمی قبائیں جن کے استر قاقم اور سیاہ ہرن کی کھال اور دوسری قیمتی کھالوں کے تھے' 10 ہزار قمیصیں اور زیر جامے' 10 ہزار کفتان' 4 ہزار دستار' ایک ہزار سر پوش' مختلف اقسام کے ایک ہزار جبے' ایک ہزار کی تعداد میں چینی کے بیش قیمت برتن' انواع واقسام کی متعدد عطریات' ایک ہزار جڑاؤ انگوٹھیاں' ڈیڑھ ہزار ریشمی قالین' ایک ہزار ریشمی گدے اور تکیے' ایک ہزار سلفچیاں' ایک ہزار مٹکے' ایک ہزار پٹکے' جڑاؤ دستوں والی دس ہزار تلواریں' ایک لاکھ پچاس ہزار نیزے' ایک لاکھ کمانیں' ایک ہزار خصوصی زرہ بکتر' 50 ہزار عام زرہ بکتر' 10 ہزار خود' ڈیڑھ لاکھ ڈھالیں' 4 ہزار جوڑے ٹخنے تک آنے والے جوتے جن میں سے بیشتر کے اندر قاقم' سیاہ ہرن کی کھال اور دوسرے جانوروں کی کھالوں کا استر تھا' اور ہر ایسے جوتے کی جوڑی میں ایک رومال اور ایک خنجر رکھا ہوا' 4 ہزار جوڑے جرابوں کے' 4 ہزار چھوٹے خیمے اپنے تمام ساز وسامان کے ساتھ.....'' (9)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارا خلیفہ جس کے خاندان سے یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ سادگی کے تمام اصولوں کی پاسداری کرے گا' اس نے ان اصولوں کو کس دھوم دھڑکے سے توڑا تھا۔ ہمیں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ عباسی خلفا شاندار لباس پہننے سے پرہیز کرتے تھے۔اور صرف سیاہ رنگ پہنتے تھے۔دسویں صدی پر ماہرانہ نظر رکھنے والے ایک شخص کا کہنا ہے کہ ''خلیفہ کے لیے یہ روایتی طور پر لازم ہے کہ ایک اونچے تخت پر اس کی نشست ہوگی' تخت پر آرمینیا کے خالص ریشم' یا ریشم اور اونی کپڑے کی پوشش ہوگی۔خلیفہ لمبی آستینوں والا لباس پہنتا ہے۔ جو سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔اوپر کا لباس سفید ریشم یا اون کا ہوتا ہے۔ جو کبھی سادہ اور کبھی کشیدہ کاری سے مزین ہوتا ہے۔تاہم وہ نقش ونگار والے کمخواب کا اور بہت بھڑکدار لباس نہیں پہنتا'' (10)۔ امام ابن جوزی کی اس بات سے بلاشبہ اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ ایک مسلمان رہنما کو اصل جنگ

عیسائی دشمنوں سے نہیں اپنی خواہشات سے کرنی پڑتی
ہے۔ ابن الجوزی نے اس سلسلے میں رسول کریمؐ کی ایک حدیث بیان کی ہے۔ جس کے مطابق اپنے نفس سے جہاد دراصل ''جہاد اکبر'' ہے جبکہ دشمن سے جہاد ''جہاد اصغر'' کے زمرے میں آتا ہے۔''(11)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہارون الرشید جہاد اکبر کی نسبت جہاد اصغر میں کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ ایک مرتبہ جب وہ اس ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک نہایت خوبرو اور مشہور شاعرہ ''عنان'' کو خریدے یا نہیں کیونکہ اس کی بہت بھاری قیمت لگائی گئی تھی' اس کے ایک درباری عصمعی نے دریافت کرلیا کہ وہ کس الجھن میں مبتلا ہے۔ خلیفہ نے اعتراف کیا کہ وہ عنان کی وجہ سے چہ کنم میں گرفتار ہے لیکن ساتھ یہ جملہ بھی کہا کہ ''دراصل یہ اس کی شاعری ہے جو میرا دل اس کی طرف کھینچتی ہے۔'' یہ سن کر عصمعی نے سلیقے سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ اس بارے میں ہارون کے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔ تب ہی اس نے کہا ''یقیناً عنان کی طرف کھنچنے کی وجہ اس کی شاعری کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا امیرالمومنین مثال کے طور پر فرزدق سے جنسی اختلاط پسند فرمائیں گے؟'' یہ سن کر ہارون الرشید نے اتنا زوردار قہقہہ لگایا کہ اس کا سر بہت پیچھے کی طرف چلا گیا۔'' (12) یاد رہے کہ فرزدق ایک ایسا شاعر تھا جو میدان جنگ کے مناظر بیان کرنے میں بے مثال شہرت رکھتا تھا اور بدصورتی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

کسی خلیفہ کے لیے کسی دل آرا کنیز کے سامنے اشعار پڑھنا یا اس کے ساتھ شطرنج کھیلنا' کسی مرد کے ساتھ ان کاموں میں مشغول ہونے سے قطعاً مختلف تھا۔ خلیفہ یقیناً اس بارے میں آزاد تھا کہ اگر وہ چاہے تو ان دلچسپیوں میں کسی مرد کو حصہ دار بنائے۔ یوں بھی ایک کثیر الثقافت' عالمی مزاج رکھنے والے' روادار عباسی دربار میں ہم جنس پرستی ایک تسلیم شدہ رویہ تھا۔ جنسی ترجیحات کو لوگوں کے درمیان ایک اور فرق کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ آپ اپنے ساتھی کے لیے اپنی ہی صنف کا انتخاب کرسکتے تھے نامعلوم معاملات کی شناوری کرسکتے تھے۔ عباسی دربار کا ایک

نہایت نادر روزگار اور حاضر جواب نگینہ مشہور شاعر ابونواس
تھا جو نوجوان لڑکوں کے حسن کے شاندار قصیدے برسر عام پڑھتا تھا۔لیکن وہ بھی کبھی کسی نہایت حاضر جواب اور ذہانت میں بے مثال جریہ کے سامنے ہار جاتا اور مختلف حسین اور عشوہ طراز کنیزوں سے اس کے تعلقات ایک کھلا راز تھے۔

24 جلدوں پر مشتمل کتاب الاغانی پڑھ جایئے تو اس میں جزئیات کی تفصیل کے ساتھ ان خلفاء کی عیش وطرب کی زندگی سامنے آجاتی ہے۔اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنس پرستی میں وہ خطرات پوشیدہ نہ تھے جتنے جنس مخالف سے تعلقات میں۔جنس مخالف سے تعلق اس لیے زیادہ خطرات رکھتا تھے کہ یہاں ایک مختلف اور نامعلوم جہت کو معلوم کرنے کا معاملہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں پرکشش اور پرادا نوجوان لڑکوں کے لیے متعدد لفظ ملتے ہیں۔جن میں سے ایک ''غلام'' ہے جس کا مفہوم ''نخریلا لونڈا'' ہے۔ یہ لفظ ہم جنس پرستی کا واضح اشارہ رکھتا ہے۔ اس رویے کے برعکس مغرب میں 1880ء تک ''ہم جنس پرستی'' کی اصطلاح عمومی طور پر استعمال نہیں کی جاتی تھی۔صرف ڈاکٹر اور نفسیات دان ایک بیماری کے طور پر اس کا ذکر کرتے تھے۔''
(13)

لیکن اگر ہم عباسی دربار کی طرف پلٹ جائیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جنس مخالف سے تعلق مہم جوئی سے کم نہ تھا۔ایک ایسا دروازہ جو ایک نامعلوم دنیا میں کھلتا تھا۔عورت: ایک ایسی
اجنبی مخلوق تھی جس کا مزاج پل میں تولہ'پل میں ماشہ تھا۔کسی مرد کے لیے اس کے عشق میں گرفتار ہونا ہمت اور جرأت کا کام اور ایک مہم جوئی سے کم نہ تھا۔ایک عورت جو معروف مفہوم میں دشمن بھی تھی کیونکہ حرم نے اسے ایک قیدی بنا رکھا تھا۔

جنس مخالف سے تعلق قائم کرنے کے لیے ہمت مردانہ کی ضرورت ہوسکتی تھی۔ ''غلامیت'' یعنی نوخیز لونڈیوں کے قصے آج ہمیں نہایت تعجب خیز محسوس ہوتے ہیں۔ملکہ زبیدہ کو توقع تھی کہ اس کا بیٹا امین تخت کا وارث ہوسکتا ہے'اس پر جب یہ انکشاف ہوا کہ اس کا بیٹا امین

ہم جنسی پرستی کے رجحانات رکھتا ہے تو اس کے ''علاج''
کے لیے ملکہ نے یہ طریقہ سوچا کہ نوخیز اور دل جو حسین کنیزوں کا انتخاب کیا اور انہیں نوجوان غلاموں کی طرح چھیل چھبیلا بنا کر امین کو ''راہ راست'' پر لانے کی کوشش کی۔ یوں اس نے بغداد میں ایک نئے فیشن کی طرح ڈالی۔ نویں صدی کے مورخ مسعودی کا کہنا ہے کہ ''زبیدہ نے ایسی کم عمر عشوہ طراز حسین لڑکیوں کا انتخاب کیا جن پر سبزہ آغاز ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ شاہی بافندوں سے ان کے لیے نفیس پارچہ جات تیار کرائے گئے' ان پارچہ سے جو لباس تیار ہوئے ان پر نازک کشیدہ کاری ہوئی' ان کے لیے طرے (دستار) تیار ہوئے۔ ان کی زلفوں کی تراش خراش ہوئی' اور ان کی کاکلیں نوجوان لڑکوں کی طرح کتر کر چھوٹی کی گئیں اور انہیں طروں کے اندر چھپایا گیا پیشانی پر لٹیں چھوڑی گئیں۔ ان کا لباس چست تھا اور اس پر سے چوڑی آستینوں والی قبائیں تھیں' کمر پر چوڑے پٹکے جوان کی کمر کی نازکی اور بدن کے خم کو نمایاں کرتے تھے۔ ان تیاریوں کے ساتھ حسینوں کا یہ پرا اس نے تحفے میں اپنے بیٹے امین کو بھیجا۔ وہ ان پر مرمٹا اور برسر عام ان کے جھرمٹ میں نظر آنے لگا۔ یہی وہ وقت ہے جب نوجوان کنیزوں کی ترشی ہوئی زلفیں' ان کی قبائیں اور چوڑے پٹکے سماج میں ہر سطح پر مقبول ہوگئے۔

انہیں ''غلامیت'' کہا جاتا۔ عربی کا یہی لفظ یورپ میں Les Garconnes کے طور پر رائج ہوا اور 1920ء کی دہائی میں نوجوان لڑکوں کی طرح لباس پہننے اور بال ترشوانے والی عورتوں کیلئے استعمال ہوتا تھا۔

نویں صدی کا بغداد اپنے سابق دشمنوں اہل رومہ اور ایرانیوں کی غیر ملکی ثقافتوں کے لیے جی کھول کر روادار ہو چکا تھا۔ چیزوں کو قبول کرنے کی اس نئی روایت نے عربوں کے لیے دولت اور عظمت کے دروازے کھول دیئے۔ یہ وہی عرب تھے جو قبل از اسلام عرب کے صحرا کے حاشیوں پر خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتے تھے۔ عباسی دربا میں طاقت ور اور بااثر ایرانیوں اور عربوں کے درمیان شدید کشمکش رہتی تھی۔ (یہ کشمکش آج کے شرقِ اوسط میں بھی واضح طور سے نظر

آتی ہے۔ 1980ء کی دہائی میں ایران، عراق جنگ کو یاد
کیجئے) اور اسی طرح صنفی کشمکش اور تضاد بھی اتنا ہی خطرناک تھا، بہ طور خاص اس وقت جب دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے تھے۔ خلفا کی طرف سے ہزاروں عورتوں کو حرم میں قید کرنا ایک شدید اقدام تھا اور جسے وہ اس لیے کرتے تھے کہ کسی حسینہ کی جانب سے رد کیے جانے کا امکان نہ رہے۔ اگر ایک (خریدی ہوئی) عورت اپنے آقا کو پسند نہ کرے تب بھی وہ اس پر دروازہ بند نہیں کرسکتی تھی، اسے چھوڑ کر جا نہیں سکتی تھی۔ اس کے باوجود حرم کی بلند و بالا اور محفوظ دیواروں کے درمیان بھی خلیفہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے خطرات مول لیتا تھا اور یہی وہ مرحلہ ہے جہاں ہم مغربی مردوں کے حرم کی طرف پلٹتے ہیں۔ کسی مرد کے جذبات کیا ہوتے ہیں جب نسائی حسن ایک تصور ہو اور اس تصور کا تانا بانا اس مرد کے تخیل نے بُنا ہو؟۔

ہارون الرشید کا حرم جہاں خلیفہ اپنی تمام حسیات کے ساتھ انتہائی شہوانی تعلقات میں الجھتا ہے۔ جب ہم اس کی طرف پیٹھ موڑتے ہیں اور انگریس اور ماتیس یا حرم پر بنائی جانے والی ہالی ووڈ کی فلموں کا رخ کرتے ہیں تو احساسات اور جذبات پر کیا گذرتی ہے؟ ایک مرد گوشت پوست کی کسی عورت خواہ وہ اس کی بیوی ہو یا محبوبہ کے سحر میں کیسے گرفتار ہوسکتا ہے۔ جب عین اس وقت وہ کسی عورت کی پینٹنگ یا کسی فلمی عکس کے عشق میں مبتلا ہو؟

یہی وہ معاملہ تھا جس کی بناء پر میں نے جین آگسٹے ڈومینک انگریس کے بنائے ہوئے شاندار ترین، پُراثر اور ناقابل تسخیر یورپی حرم میں دوبارہ حاضری دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مصور کیا ہوا حرم خواہ انیسویں صدی سے تعلق رکھتا ہو لیکن وہ مغرب میں ہزار ہا کتابوں کے سرورق پر سی ڈی جیکٹ اور رسائل پر نظر آتا ہے اور آج کی ڈیجیٹل دنیا میں پہلے سے کہیں زیادہ موجود ہے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر میں کسی طرح انگریس کے حرم کی دنیا کو سمجھ سکوں تو شاید میں مغربی مرد کے نفسی اسرار و رموز اور ان کے جذباتی اور شہوانی منظرنامے کی چند گتھیاں سلجھا سکوں۔ عورتوں

کے بارے میں اگر میں مغربی مردوں کے جذبات و
احساسات کو سمجھ سکوں تو شاید کمال سے میری جھڑپیں کچھ کم ہو سکیں۔ شاتو بریان وہ ریسٹورنٹ ہے جو ہماری یونیورسٹی کے قریب تھا اور جہاں ہم سب دوست اور ہم کار ہر سہ پہر Couscous کے لیے جمع ہوتے۔ اور جب بھی میری آواز قدرے بلند ہوتی تو کمال مجھے ٹوکتے ہوئے کہتا ''فاطمہ! میں اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ تم عربوں کی تاریخ کے بارے میں کتنا زیادہ اور میرے بارے میں کتنا کم جانتی ہو'' اس کا یہ جملہ میرا دل توڑ دیتا' مجھے احساس جرم ہونے لگتا۔ میں اس سے فوراً معافی کی طلب گار ہوتی اور اس کا ہاتھ
تھامنا چاہتی لیکن میرے ان تمام جذبات پر اوس پڑ جاتی کیونکہ وہ تمام مراکشیوں کی طرح مجھے یاد دلاتا کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ جوڑے بر سر عام ایک دوسرے کو چھوئیں۔ ''فاطمہ برائے مہربانی اپنے آپ کو سنبھالو'' وہ کہتا ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہماری یونیورسٹی کا ڈین ہمارے بائیں جانب اور ہمارا قدامت پسند ملا بن کیکی ہمارے دائیں جانب بیٹھا ہے؟''۔

مجھے مردوں کے بارے میں جاننے اور حیران کر دینے والے ردعمل کو سمجھنے کی اشد ضرورت تھی۔ کئی دہائیوں کے عرصے میں کمال کو سمجھنے کی کوششوں کے باوجود یہ احساس میرے صدمے کا سبب تھا کہ میں اپنی کسی بات سے اس کو اس قدر ناراض کر دیتی کہ وہ بعض اوقات اور کبھی کبھی مہینوں تک میری صورت نہیں دیکھتا تھا۔ ایسے مواقع پر میں ہمیشہ یونیورسٹی کے تمام دوستوں اور جاننے والوں کو اس کام پر لگا دیتی کہ وہ ہمارے درمیان مداخلت کریں اور میری طرف سے معافی کے طلب گار ہوں۔ اس کے باوجود چیزوں کو پرانی صورتحال کی طرف لوٹنے میں خاصا وقت لگ جاتا۔ کسی مرد کے ذہن کو سمجھنا یا یہ جاننا کہ اس کے احساسات کس طرح کام کرتے ہیں کسی عورت کے لیے یقیناً ایک آسان کام نہیں ہے۔ میں نے زندگی میں بہت سے نئے ہنر سیکھے ہیں جن میں نئی زبانوں سے شناسائی حاصل کرنا' کمپیوٹر پر کام کرنا' جیسے معاملات شامل ہیں۔ لیکن میں اس بارے میں زیادہ آگاہی حاصل نہیں کر سکی ہوں کہ ایک مرد کے جذبات

کس طرح کام کرتے ہیں۔

لیکن آیئے پھر حرم کی طرف چلتے ہیں جو میرے لیے ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ سرحدوں یا حدود کے ساتھ اور غیر مستحکم مراعات کے ساتھ کیا گزرتی ہے؟ جب فلمائی ہوئی اور مصور کی ہوئی شبیہیں، جنسی حرکیات کی ترکیبی حکمت عملی کی طرح متعارف کرائی جاتی ہیں؟ کیا انگریس کی کنیزیں

اسے خود اپنے جذبات سے محفوظ رکھنے کے لیے تھیں۔ میں موسیو انگریس کی دنیا میں واپس جانے کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔

(10)

موسیو انگریس: ایک مغربی حرم کی قربت میں

یہ کیسے ممکن ہوا کہ موسیو انگریس نے ایک پادری کے سامنے حاضر ہو کر ایک عیسائی عورت سے شادی کی اور اس کے ساتھ ساتھ سب کے علم واطلاع میں برہنہ کنیزوں کی روغنی تصویریں بناتا رہا؟ وہ جب La Grande Odalisque کی پنڈلیوں اور کولہوں کو گھنٹوں تکتا تھا تو کیا اس کی بیوی کو حسد محسوس ہوتا تھا؟ ایک عرب عورت کے طور پر میں تو اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہارون الرشید کے حرم کی کوئی کنیز ہارون پر نظر رکھتی ہوگی۔ وہ حرم جہاں حسد کی آگ بھڑکتی تھی اور ان گنت زندگیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی تھی۔ موسیو انگریس کو اپنی بیوی سے عشق تھا یا ان دونوں کی شادی رواج کے مطابق ہونے والی ایک شادی تھی؟ کیا وہ وحشیانہ جذبات رکھنے والا ایک شخص تھا جس کی ہوسناک خواہشات کو پورا کرنے سے میڈم انگریس قاصر تھی اور اسی لیے اس نے اس حقیقت سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی تسکین کے لیے برہنہ عورتوں کی تصویر بنائے گا؟ کسی فرانسیسی گھر میں ان پراسرار ترک کنیزوں کی موجودگی کی شاید یہی وجہ ہو۔

یہ وہ توضیح ہے جو میرے آبائی شہر فیض میں اس
وقت دی جاتی ہے جب ادھیڑ عمر کی کوئی عورت اپنے شوہر کی ہوس ناک خواہشات کی تسکین کی خاطر اس کے لیے نوجوان بیوی کی تلاش شروع کر دیتی ہے۔ یا کم سے کم یہی وہ وجہ ہے جو خاندان میں سرکاری طور پر بیان کی جاتی ہے حالانکہ عموماً اس کا اصل سبب معاشیات ہوتی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کثیر الزوجگی کو مرد اپنے مقدس حق کے طور پر نافذ کرتے ہیں وہاں بڑھتی ہوئی عمر والی بیوی رضا کارانہ طور پر اپنے شوہر کے لیے دوسری بیگم کی تلاش شروع کر دیتی ہے' تا کہ وہ کسی طرح اس گھر میں رہ سکے۔ بیوی اپنی انا اور عزت نفس کا گلا گھونٹ دیتی ہے اور حاسدانہ جذبات پر قابو پا کر اپنے لیے ایک نیا کردار تراشتی ہے۔ پس منظر میں رہنے والی باوقار' جنسی خواہشات سے دستبردار ہو جانے والی بڑی بیگم۔ اگر آپ کو کسی تنخواہ کا تحفظ حاصل نہ ہو یا آپ کی آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ ہو' تو دوسری نوجوان عورت پر نثار ہونے والے شوہر کے سامنے حاسدانہ جذبات کا اظہار پائی پائی سے محتاج ہونے اور مستقبل کا خطرہ مول لینے کا مترادف ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ حسد کیسا ذلیل کرنے والا جذبہ ہے۔ میں جب کبھی حسد میں مبتلا ہوتی ہوں' صرف اس وقت میں سمجھ سکتی ہوں کہ کسی جرم کا ارتکاب کرنا کتنا آسان ہوتا ہوگا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مسلمان عورتیں جو اپنے حسد کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی لیتی ہیں وہ مذہب کا سہارا لیتی ہیں۔ اپنے لیے ایک روحانی طرز زندگی وضع کرتی ہیں۔ پابندی سے مسجد جاتی ہیں اور مذہبی تقریبات میں شرکت کرتی ہیں۔ آخر کار یہ ''مشرق'' ہے جہاں عورتوں کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں پر مقدس قانون کا پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن جب مجھ ایسی جدید مسلمان عورت جو تنخواہ دار ہے' وہ اگر حاسد ہے تو اس کا غیظ و غضب بے پناہ ہوتا ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھانے والے میرے کئی مرد ساتھی اپنی حاسد بیویوں یا محبوباؤں کی مجھ سے شکایتیں کرتے ہیں کہ وہ ان کی کار کے ٹائروں کے اس طرح چیتھڑے اڑاتی ہیں کہ وہ آئندہ انہیں ناراض

کرنے کے بارے میں کوئی مرتبہ سوچتے ہیں مادام
انگریس خوش نصیب تھیں کہ انہیں انقلاب فرانس نے پادریوں اور ان کی اجارہ داریوں سے نجات دلادی تھی۔ آپ ہی سوچیں کیا ایسا نہیں ہوا تھا؟ کیا واقعی انہیں یہ دیکھ کر لطف آتا تھا کہ ان کا محبوب شوہران کی اتنی حسین رقیبوں کے بارے میں کھلم کھلا خواب دیکھتا رہے؟ کیا وہ کبھی اس پر گرجی برسی تھیں کہ وہ ان کنیزوں کی تصویریں بنانا بند کردے؟ یا موسیو کو صوفے پر گرا کر اس سے مقاربت کی تھی؟ ان کی جگہ اگر میں ہوتی تو موسیو کے برش دفن کر دیتی یا انہیں ضرورت مند مصوروں میں تقسیم کر دیتی۔ فرانسیسی آخر جذبات پر کیسے قابو پاتے ہیں؟ انسانی حقوق اور شہریت کا فرانسیسی میثاق کیا حسد کے بارے میں بھی میں کچھ کہتا ہے؟

1789ء کو جب فرانسیسوں نے ''آزادی' مساوات اور اخوت'' کے نعرے کو فرانسیسی جمہوریہ کا سنگ بنیاد بنایا' اس وقت انگریس 9 برس کا تھا اور وہ فرانسیسی انقلاب کے آدرشوں کا سچا بیٹا تھا۔ وہ ایک سفید پوش گھرانے میں پیدا ہوا اور کسی مشکل کے بغیر سماجی مرتبے کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اس کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا گیا' اسے اعزازات دیئے گئے اور وہ بھاری انعام واکرام سے نوازا گیا۔ اگر فرانسیسی جمہوریہ نے سماجی حالات بدل دیے تھے اور وہ راستہ ہموار کر دیا تھا جس پر چل کر کم حیثیت گھرانوں کے بچے اپنے ہنر میں بلندیوں پر پہنچ سکیں اور معاشی اعتبار سے خوش حال ہوسکیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ رومان اور جذباتی تسکین کے مواقع بھی بہم پہنچائے جائیں گے۔

انگریس کی زندگی فرانسیسی جمہوریہ کا ایک شاندار اشتہار نظر آتی ہے۔ لیکن انقلاب فرانس اس کامیاب نوجوان کو جذباتی اعتبار سے باہمت نہیں بنا سکا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے انتخاب میں پہل کاری کی ہمت نہیں رکھتا تھا اور اس نے اپنی شادی روایتی انداز میں کی۔ دونوجوان لڑکیاں جو اسے اچھی لگیں ان سے اس کی منگنی ہوئی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے دونوں منگنیاں ٹوٹ گئیں۔
ایک عرب عورت کے طور پر میں انسانی حقوق کے معاملات سے بہت زیادہ متعلق ہوں۔

میرے لیے انگریس کی زندگی بہت مسحور کن ہے۔ وہ ایک
آزاد مغربی مرد تھا جس کی تربیت جمہوری خیالات کے مطابق کی گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی بیوی کا انتخاب خود نہیں کر سکتا تھا اور کنیز عورتوں کو مجسم حسن سمجھ کر ان کے خواب دیکھتا تھا۔ میں یہ سوچتی رہی کہ مردوں کو کیسے انقلاب کی ضرورت ہے جس کے بعد وہ خود مختار اور آزاد عورتوں کو حسنِ مجسم سمجھیں۔؟

1789ء کا انسانی اور شہری حقوق کا فرانسیسی فرمان تاریخ انسانی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں عورتوں کی محکومیت کو مطلق العنانی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا گیا تھا۔ مطلق العنانیت اور غلامی دونوں کو ایشیائی اقوام کی شرمناک خصوصیات میں سے بیان کیا گیا تھا۔ اپنی کتاب The Spirit of Laws میں مونٹیسکیو نے لکھا کہ ''عورتوں کی محکومی' مطلق العنان حکومت کے اصولوں سے مطابقت رکھتی ہے جو ہر شے کی تحقیر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیا میں گھریلو محکومیت اور مطلق العنان حکومت ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔''(1)۔

مونٹیسکیو 1689ء میں پیدا ہوا اور اس کا انتقال 1755ء میں انگریس کی پیدائش سے 25 برس پہلے ہوا' اس نے فرانسیسیوں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ ایشیائی مطلق العنانیت جس کی مونٹیسکیو نے اپنی جمہوریت کو سراہتے ہوئے اتنے واضح الفاظ میں مذمت کی۔ وہ دراصل ترکوں کی خلافتِ عثمانیہ تھی۔(2)

ایسی صورتحال میں ہم اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ ایک ایسا مصور جو انقلاب فرانس کے ابتدائی دنوں میں ترک کنیزوں کو حسن کے مثالی نمونے کے طور پر پیش کر رہا تھا' وہ ایک غیر مہذب وحشی کے طور پر رد کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن اس کے بالکل برعکس ہوا' انگریس نہ صرف ایک مصور کے طور پر بہت کامیاب رہا بلکہ اس نے کنیزوں کی جو روغنی تصویریں بنائیں وہ اس صدی کے بعض نہایت بااثر سیاستدانوں نے منہ مانگے داموں خریدیں۔

انگریس Tarn-et-Garonne کے ایک چھوٹے سے شہر Montauban میں ایک

کم حیثیت گھرانے میں پیدا ہوا۔ ''اس کا باپ جین ماری جوزف نے Montauban میں رہائش اختیار کی اور آرائشی مجسمہ ساز کے طور پر کام شروع کیا۔ لیکن جلد ہی شہر میں فن مجسمہ سازی سے متعلق ہر کام کرنے لگا۔ 1777ء میں اس نے Anne Moulet سے شادی کی جو کورٹ آف ایڈیز کے ایک ماہر فن وگ بنانے والے کی بیٹی تھی۔ اس شادی سے ان دونوں کے پانچ بچے ہوئے جن میں سب سے بڑا Jean- Auguste- lominique تھا۔''(3)۔ انگریس کے بچپن میں Montauban ایک فساد زدہ شہر تھا۔ اور اس کی ابتدائی زندگی مذہبی تشدد کے سائے میں بسر ہوئی۔ ایک ایسا شہر جو سماجی طور پر انتشار کا شکار ہو وہ کسی بچے کے رہنے کے لیے مناسب نہیں ہوتا اور بہ طور خاص ایک ایسے بچے کے لیے جو ایک بڑے خاندان کا پہلوٹا بچہ ہو اور جس کے باپ کی کوئی مستقل آمدنی نہ ہو۔

انگریس ایک سیکولر جمہوریہ میں پیدا ہوا تھا جو آزادیٔ افکار کی ضمانت دیتی تھی اور جس نے پادریوں کو سیاسی اقتدار سے محروم کر دیا تھا۔ اس کے باوجود مذہب کے بہت زیادہ اثرات موجود تھے۔ بچپن میں وہ بپتسمہ کی رسم سے لے کر گلے گلے پانی عیسائی ثقافت میں ڈوبا ہوا تھا' کچھ دنوں بعد وہ ایک مذہبی اسکول میں بھیج دیا گیا۔ جہاں اس نے اپنے سخت گیر استادوں کو موسیقی اور ڈرائنگ جیسے ''ملحدانہ'' اور فحش شعبوں میں نمایاں کامیابی سے حیران کر دیا۔'' ابتدائی طور پر اس بچے کو ''برادر آف کرسچن اسکول'' میں داخل کرایا گیا۔ یہاں پڑھانے والے راہب اس وقت کے حالات سے بہت پریشان تھے۔ اور نئے زمانے سے مطابقت پیدا کرنے کی کوششوں میں تھے۔ وہ بہت کم پڑھاتے اور وہ بھی پھوہڑپن کے ساتھ۔ بچے نے جو تھوڑا بہت علم حاصل کیا۔ اس کا معیار بہت پست تھا اور بنیادی چیزوں کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ انگریس کو بہت دنوں تک اس بات کا صدمہ رہا لیکن اس کے باوجود وائلن بجانے اور پنسل سے خاکہ بنانے کا شاندار ہنر اس سے ظاہر ہوتا رہا۔''(4)

موسیقی سے لگاؤ اور وائلن بجانے کا شوق عمر بھر اس کے ساتھ رہا اور اس نے فرانسیسی زبان کو ایک نیا طرز اظہار دیا جو "Le Violon d,Ingres" کہلاتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جس کے اندر بہت سی صلاحیتیں ہیں۔اسے ان میں سے کئی سے کنارہ کرنا پڑتا ہے اور وہ ان سے صرف شوق کے طور پر اپنے فارغ وقت میں دل بہلا سکتا ہے۔اس کے باوجود ماہرین کا کہنا ہے کہ انگریس ایک بے مثال موسیقار تھا۔

11 برس کی عمر میں انگریس Toulouse کی اکیڈمی سے وابستہ ہوا اور 17 برس کی عمر میں اس کی مصوری کی صلاحیتیں اتنی حیران کن اور شاندار تھیں کہ اسے عظیم مصور جیکوئس لوئی ڈیوڈ کے اسٹوڈیو میں کام سیکھنے کے لیے پیرس بھیج دیا گیا۔وہاں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کام کرنے والے ایک پُر آسائش اور پُر لطف زندگی کے مزے اٹھاتے ہیں جس سے وہ ناآشنا ہے۔انگریس کے سوانح نگار Norman Schlenoff کا کہنا ہے کہ اس احساس نے انگیریس میں اپنے معمولی پس منظر کا ایک ایسا احساسِ شرم پیدا کیا جس پر وہ عمر بھر قابو نہ پاسکا۔وہ جب اپنے چچا کے کیفے میں ایک ویٹر کے طور پر کام کرتا تھا۔تو گلاس دھوتے ہوئے' گاہکوں کے قلمی خاکے بناتے ہوئے اور پڑوس میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والے آرکسٹرا میں اپنے ہنر کو آزماتے ہوئے وہ کبھی کبھار ہی کسی سے مخاطب ہوتا تھا۔لیکن جلد ہی وہ وقت آیا جب اس نوجوان مصور نے اپنے خوشحال ساتھیوں سے حساب کتاب بے باق کر دیا۔

21 برس کی عمر میں اسے روم کا پہلا گرانڈ پرائز مل گیا۔یہ وہ اعزاز تھا جس کی آرزو ڈیوڈ کے نقاش خانے میں کام کرنے والا ہر نوجوان مصور کرتا تھا۔اس اعلیٰ اعزاز نے اسے اس قابل بنادیا کہ روم کی فرنچ اکیڈمی میں اپنی تربیت مکمل کر سکے۔معاشی مسائل نے 5 برس تک اس اکیڈمی میں جانے کی راہیں اس کے لیے مسدود رکھی تھیں۔1806ء میں ملنے والے اس اعزاز کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسے فوجی خدمات انجام دینے سے چھوٹ مل گئی۔ایک ایسے زمانے میں

جب نپولین کی فوجیں یورپ اور بحیرۂ روم کے ملکوں کا

نقشہ بدل رہی تھیں' یہ کوئی معمولی چھوٹ نہ تھی۔ 1798ء میں فرانسیسی لشکر مصر کو فتح کر چکا تھا جو مسلم دنیا کا ایک شاندار ہیرا سمجھا جاتا تھا اور جس پر عثمانی سلاطین کی حکومت رہی تھی۔ اس فتح نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا کیونکہ اس سے پہلے تک یہ عثمانی سلاطین تھے جو یورپ کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ یہ وہی سال ہے جب انگریس اٹھارہ برس کا

ہوا تھااوراس نے فوجی خدمات سے جان چھوٹنے پر سکون کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ خون پر نظر پڑنا اس کے لیے ایک قابل نفرت اور کراہت انگیز بات تھی۔ اس زمانے کے اکثر مصور جنگ کے مناظر کو مصور کرنے میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن انگریس نے زندگی میں کبھی بھی میدان جنگ کا کوئی منظر مصور نہیں کیا۔ اس زمانے میں سرکاری خرچ پر شاندار ملکوں کا سفر اور سفارتی مشن سے وابستگی' فرانسیسی مصوروں کے لیے اسی وقت ممکن تھی جب انہیں میدان جنگ کے مناظر مصور کرنے کی دعوت دی جائے۔ مثال کے طور پر انگریس کے ہم عصر Delacroix کو 1832ء میں سفارتی مشن کے ساتھ مراکش کا سفر کرنے کی دعوت دی گئی۔ اسی سفر کے دوران Delacroix کو الجزائر کا ایک چکر لگانے کا بھی موقع ملا۔ جس کے دوران اس نے ایک حرم کا جائزہ لیا۔ یہی سفر اس کی مشہور پینٹنگ Women of Algiers کو بنانے کیلئے مہمیز ثابت ہوا۔ چند برس بعد فرانس پہنچ کر اس نے چند خاکوں' ڈائریوں اور یادوں کی بنیاد پر یہ پینٹنگ بنائی۔ (5)

انگریس کو کسی سفارتی مشن کے ساتھ جانے یا مشرق کے سفر کی کوئی خواہش نہیں تھی اور بہ ظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات اس کی کامیابیوں کے سفر میں کوئی رکاوٹ نہیں بنی۔ بہت بعد میں یہ 1834ء تھا جب اسے روم کی فرانسیسی اکیڈمی کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ وہ جب اپنے عہدے کی مدت پوری کر کے 1841ء میں پیرس واپس پہنچا تو اس کا شاندار استقبال ہوا۔

''مارکوئیس ڈی پاسٹوریٹ نے اس کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ جس میں 426

مہمان مدعو کیے گئے تھے۔ عشائیے کے بعد ایک کنسرٹ
ہوا۔ جس کی پیشوائی Berlioz نے کی۔ شاہ لوئی فلپ نے اسے ورسائی کے محل میں مدعوت کیا
اور اپنے گھر Neuilly میں اس کا خیر مقدم کیا۔ اس سے پورٹریٹ بنوانے کی درخواستوں کے
ڈھیر لگ رہے ہیں۔''(6)

1850ء میں وہ Ecole des Beaux Arts کا صدر بنایا گیا۔ 1855ء میں اسے
یہ اعزاز حاصل ہوا کہ فرانس کے لیجن ڈی آنر کا کراس آف گرانڈ آفیسر۔ اسے شہنشاہ نے
اپنے دست خاص سے عطا کیا اور آخر کار 1862ء میں وہ سینیٹر نامزد ہوا اور 215 فرانسیسی
مصوروں کی طرف سے (طلائی تمغہ) Medaille d,Or دیا گیا۔

یہ درست ہے کہ انگریس کا میدان جنگ میں نپولین سے آمنا سامنا نہیں ہوا لیکن
نپولین سے انگریس کی جان نہ چھوٹ سکی۔ 1803ء میں انگریس کو حکم ملا کہ اسے کمانڈر کی
پورٹریٹ بنانی ہے۔ اس عہد کے 2 اور مصوروں میں سے ایک Greuze کو بھی یہی کام تفویض
ہوا۔ دونوں مصوروں نے ایک ساتھ سفر کیا اور Lviege میں فرسٹ کونسل کے گھر پہنچے۔ جہاں
انہیں ایک مختصر نشست میں نپولین کا خاکہ اتارنا تھا۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا
کہ ''سیماب صفت نپولین کے پاس خاکہ بنوانے کے لیے بہت کم وقت ہے'' (7)۔ اس عہد کے
تمام فرانسیسی مصوروں کا یہ خواب تھا کہ وہ نپولین کا پورٹریٹ بنا سکیں۔ اس اعتراف فن اور اہم
کام کے بعد انگریس کو رومان اور محبت کا خیال آیا اور اس نے اپنے لیے دلہن کی تلاش شروع
کر دی۔

وہ دو عورتیں جن سے انگریس نے محبت محسوس کی اور ان میں سے کسی ایک سے شادی
کرنے کی خواہش کی، وہ خاموش اور تابعدار کنیزیں نہیں تھیں۔ ان میں سے پہلی مادموزیل جولی
فورسٹیر تھی جو خود بھی ایک موسیقار اور مصور تھی۔ سرکاری طور پر اس کی منگنی کا اعلان جون 1806ء

میں ہوا جب انگریس خود 26 برس کا تھا۔ لیکن چند ہی
دنوں بعدان دونوں کوجدا ہونا پڑا کیونکہ ان ہی دنوں انگریس کے پاس رقم آ گئی تھی جس کے فوراً بعداس نے روم کا رخ کیا۔ اکتوبر 1806ء میں وہ اٹلی کے شہر پہنچا اور زندگی میں پہلی مرتبہ اوسیٹا میں اس نے سمندر کی جھلک دیکھی۔ یہ روم سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک پُرفضا مقام تھا۔ فرنچ اکیڈمی، ولا میڈچی کی عالیشان اور پرشکوہ عمارت میں قائم تھی۔ اکیڈمی کے ڈائریکٹر نے فوراً ہی اسے اس کا ذاتی اسٹوڈیو دے دیا جس کی کھڑکیوں سے Pincio کا شاندار منظر دکھائی دیتا تھا۔

روم میں ٹک کر بیٹھ جانے کے بعد انگریس جو اپنی منگیتر کو نہیں بھولا تھا اس نے فوراً ہی اپنے ہونے والے خسر کو ایک تحفہ بھیجا۔ وہ ولا بوغیز کے ایک دلکش منظر کی پینٹنگ تھی۔ ایک برس بعد 1807ء میں اس نے میڈموزیل فورسٹیر سے اپنی منگنی توڑ دی۔ جس کے فوراً بعد میڈموزیل نے اس کی بنائی ہوئی پینٹنگ واپس بھجوادی۔ اسی برس شاید اپنی مایوسی کی اشک شوئی کے لیے اس نے La Baigneuse a mi-corps پینٹ کی جس میں ایک برہنہ عورت کی پشت نظر آ رہی ہے اور اس کے دونوں بازو اس کے سینے پر ہیں۔ اس کے سر پر لاپرواہی سے بندھی ہوئی دلکش ریشمی دستار ہے، دستار کا یہ انداز انگریس کی بعد کی کنیزوں کی روغنی تصویروں میں بھی نظر آ تا ہے۔ اس کی مشہور پینٹنگ Baigneuse de Valpincon (والپنکون کی نہانے والی) میں بھی دستار کا یہی لاپروایانہ انداز ہے۔ یہ تصویر اس کے خریدار کے نام سے مشہور ہوئی۔ مصوری کے نقاد رابرٹ روزن بلم کا کہنا ہے کہ ''انگریس نے برہنہ عورتوں کی جو تصویریں بنائیں ان میں یہ سب سے پہلی شاندار تصویر تھی، یہ ایک ایسی مبہوت کر دینے والے سکوت اور ہاتھ نہ آنے والی ہیشگی کی دنیا اور کلاسیکی تکمیلیت ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے جو ہر عہد میں مغربی مصوری کو یاد آتی ہے۔''(8)۔ یہ پراسرار، بے چہرہ نہانے والی انگریس کو پچاس برس سے زیادہ مدت تک بار بار یاد آتی رہی۔ وہ جب 80 برس سے زیادہ کا ہو چکا تھا تب اس نے Turkish

Bath' 1862ء میں ختم کی۔ اس وقت بھی یہ نہانے
والی،ہمیں اس تصویر کے عین وسط میں نظر آتی ہے۔روزن بلم کا کہنا ہے کہ"انگریس کو یقیناً اس بات کا ادراک ہوگیا تھا کہ اس برہنہ عورت میں اس نے نا قابل تغیر کاملیت حاصل کرلی ہے۔ جس طرح رافیل نے اپنی ایجاد کردہ ابدی ہم آہنگی کومختلف اور متنوع پہلوؤں سے پینٹ کیا۔اسی طرح انگریس اپنی ہی بنائی ہوئی پینٹنگ Bather of Valpincon کے نہانے کومختلف زاویوں سے بناتا چلا گیااور پھراس کی تکمیلThe Turkish Bath میں ہوئی۔"(9)

اپنی پہلی محبت میں ناکامی کے بعد انگریس نے دوسری منگنی کرنے میں پانچ برس کا وقفہ دیا۔اس مرتبہ اس کی منگیتر ایک شاندار سکینڈے نیوین خاتون تھی۔اس وقت وہ 32 برس کا ہو چکا تھا جب اس نے 1812ء میں اپنے والدین سے لارا کو اپنی شریک حیات بنانے کی اجازت مانگی، وہ ایک ڈینش ماہر آثار قدیمہ کی بیٹی تھی لیکن یہ پہلی منگنی سے بھی کم مدت میں اچانک ختم ہوگئی۔

اسی سال انگریس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ شریک حیات کے چناؤ کا رومانی طریقہ اختیار نہیں کرے گا اور کسی ایسی عورت سے شادی کرے گا جو اس کے لیے بالکل اجنبی ہوگی۔اس نے روم کے فرانسیسی دربار سے متعلق ایک اعلیٰ افسر اپنے دوست موسیو لاریل کی بیوی سے اس سلسلے میں رجوع کیا۔مادموزیل لاریل نے 31 سالہ میڈیلین شاپیل کا نام تجویز کیا جو رشتہ میں اس کی عم زاد تھی اور پیشے کے اعتبار سے آج کی زبان میں فیشن ڈیزائنر تھی۔انگریس نے اس سے خط وکتابت کی جس کے نتیجے میں اس سے شادی کا فیصلہ کیا حالانکہ انگریس نے اسے دیکھا تک نہ تھا۔اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ دونوں کی ملاقات کرادیں۔میڈیلین اپنے مستقبل کے شوہر سے ملنے کے لیے آئی اور ان دنوں کی ملاقات روم سے باہر نیرو کے مقبرے کے قریب اس سڑک
پر ہوئی جو فرانس کو جاتی تھی۔

4 دسمبر 1813ء کوانگریس اور میڈیلین شاپیل
شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔انگریس کی گھریلو زندگی کے بارے میں ہمیں زیادہ نہیں معلوم لیکن یہ بات حتمی ہے کہ انگریس اور میڈیلین نے یک زوجگی کی زندگی گزاری' تاہم شادی کے صرف ایک برس بعد انگریس کی جذباتی زندگی میں وہ عورت داخل ہوئی جو اس کی Grand Odalisque کے نام سے مشہور ہوئی۔لیکن میڈیلین نے کسی مسلمان عورت کی طرح نہ احتجاج کیا اور نہ شور شرابہ' میرے آبائی شہر فیض میں اگر شوہر دوسری شادی کرلیں تو بیویاں قیامت مچا دیتی ہیں۔وہ سماں ہوتا ہے جیسے کسی کے جنازے پر گریہ وزاری ہورہی ہو اور حرم کے آنگن میں سارے دوست اور رشتہ دار اکٹھا ہوکر اس آہ وبکا میں شریک ہوتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ کثیر الزوجگی ایک مردانہ قانون ہے اور ادارے کے طور پر رائج ہے لیکن عورتوں کی طرف سے جذباتی طور پر اس قانون کی قطعاً پذیرائی نہیں ہوتی۔مورخین نے ایسی کئی ملکاؤں کے بارے میں لکھا ہے جنہوں نے اپنے شوہروں کو اس وقت گلا گھونٹ کر یا ان کا دم گھونٹ کر ہلاک کردیا جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ دوسری شادی کرنے والے ہیں' یا بعض حالات میں دوسری بیگم جب سر پر آن پہنچی۔کچھ مورخین کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر اس حسد کا شکار عورتیں ہوتی تھیں۔ Alev Lytle Croutier اپنی کتاب ''حرم'' میں لکھتی ہے کہ ''توپ کاپی محل کے آرکائیوز میں سترہویں صدی کا ایک مخطوطہ موجود ہے جس میں سلطانہ گل نش اور کنیز گل بیاض (سفید گلاب) کے درمیان رقابت کا قصہ موجود ہے۔جس کا المناک انجام ہوا۔سلطان محمد چہارم گل نش پر دیوانہ وار فدا تھا.....لیکن جب گل بیاض اس کے حرم میں داخل ہوئی تو اس کی عنایات اس پر ہونے لگیں۔گل نش جو سلطان کے عشق میں گرفتار تھی وہ دیوانگی کی حد تک حسد کا شکار ہوگئی۔ ایک روز جب گل بیاض ایک چٹان پر بیٹھی سمندر کا نظارہ کررہی تھی گل نش نے اسے دھکا دے دیا' یوں وہ نوجوان کنیز ڈوب کر ختم ہوئی۔''(10)

یہ 1814ء کا سال تھا اور انگریس 34 برس کا ہوا تھا۔اس کی فرانسیسی بیوی میڈیلین چلتی

پھرتی رہتی اور گھر کے بہت سے کام کرتی رہتی۔ La Grande Odalisque اس لیے وجود میں لائی گئی تھی کہ وہ کچھ نہ کرے، نیم دراز رہے اور حسین نظر آتی رہے۔ حقیقت یہ تھی کہ انگریس جو مہینوں ایک حسین اور دلبر باعورت کو کینوس پر اتارتا رہا تھا وہ دراصل روزانہ اپنی بیوی سے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بدصورت ہے۔ یا کم سے کم کوئی مسلمان عورت یہی سمجھتی۔ انگریس نے جو فرانسیسی حرم تخلیق کیا تھا اس میں عورتوں اور مردوں کے جذبات کیا رنگ دکھاتے ہیں، یہ میرے لیے نا قابل فہم ہے۔ انگریس کے جذباتی مسائل کیا تھے؟ کیا وہ اپنی بیوی سے جذباتی طور پر بہت زیادہ وابستہ ہوتے ہوئے گھبراتا تھا؟ مجھے احساس ہوا کہ مشرق اور مغرب کے درمیان تہذیبی فرق کو سمجھنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ان دونوں تہذیبوں کے جذباتی منظرنامے کو سمجھا جائے۔ یقینی طور پر میں اپنے جذباتی مسائل کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکوں گی اگر میں یہ سمجھ سکوں کہ میڈیلین انگریس کے اندر حسد اور جلن کے جذبات کیوں نہیں پید اہوئے تھے۔

یا پھر یہ تھا کہ میڈیلین انگریس کے اندر حسد کے جذبات پیدا تو ہوتے تھے لیکن وہ ان کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتی تھی؟ کیا مغربی عورتیں حسد کا اظہار اس لیے نہیں کرتیں کہ وہ یک زوجگی سے لطف اٹھاتی ہیں اور اسے اس رعایت کی قیمت سمجھ کر اس کے اظہار سے گریز کرتی ہیں؟ یہ خیال آتے ہی میں لوور کے تہ خانے کی طرف دوڑی جہاں بڑے بڑے کتاب گھر تھے، وہاں سے میں نے انگریس پر کئی اور کتابیں خرید لیں اور انہیں لے کر ریولی کے دھوپ سے روشن ایک کیفے میں جا بیٹھی اور میں نے ان کتابوں کو تیزی سے پڑھنا شروع کر دیا تا کہ میڈیلین انگریس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کر سکوں۔

مجھے بہت کم معلومات حاصل ہو سکیں لیکن میں نے یہ ضرور جان لیا کہ مورخین انگریس کی نجی زندگی کے بارے میں اتنا ضرور جانتے تھے کہ اس نتیجے پر پہنچ سکیں کہ یہ جوڑا ایک دوسرے کے ساتھ خوشگوار لمحات بسر کرتا تھا۔ معاشی اعتبار سے انگریس خوشحال تھا اور اس کا شمار فرانسیسی

جمہوریہ کے بارہ صف اول کے مراعات یافتہ مصوروں
میں ہوتا تھا۔ (11)''وہ دریادل تھااور اکثر اپنے ملنے والوں کی خاطر تواضع کرتا اور ایسا کرتے
ہوئے شاہ خرچی کا مظاہرہ کرتا۔اوپیرا جانا اس کا محبوب مشغلہ تھا اور اسے کیک پیسٹری کھانے کا
بھی بہت شوق تھا۔وہ دوسرے آرٹسٹوں کے لیے برہنہ پوز کرنے سے بھی بہت لطف اٹھاتا تھا'
یہ رجحان اس میں بالکل نوجوانی میں پیدا ہوا تھا۔جب وہ ڈیوڈ کے نگارخانے میں کام کر رہا تھا اور
جہاں نو آموز مصور روایتی طور پر ایک دوسرے کے لیے برہنہ بیٹھتے تھے۔''ایک طالبعلم کا اس
وقت کا بنایا ہوا خاکہ محفوظ رہا ہے جس میں انگریس برہنہ بیٹھا ہے۔اور پستہ قامت اور گھٹے
ہوئے بدن والا ہے۔اس کے ہاتھ میں ایک شاندار کمان ہے اور وہ تیزی سے قدم آگے بڑھا رہا
ہے۔''(12) بعد میں بھی''مصوری کو آگے بڑھانے کے لیے اس میں یہ رجحان قائم رہا۔وہ
جب The Vow of Louis XIII پینٹ کر رہا تھا تو اس نے کنواری مریم کی تصویر بنانے
کے لیے خود کو برہنہ کیا اور ایک دوست سے درخواست کی کہ وہ اس کی ٹانگوں کی پوزیشن کو اسکیچ
کردے۔''(13) 1840ء میں وہ جب لگ بھگ 60 برکا تھا اس کے ایک ہم عصر مصور کے
مطابق وہ برہنہ ہوگیا اور اس نے کمرے میں دوڑنا
شروع کردیا۔ یہاں تک کہ وہ ہلکان ہوگیا اور بے ترتیب سانسوں کے ساتھ گدے پر گر
پڑا۔''(14)۔اس کے ہم عصر نے لکھا ہے کہ''چھوٹے سے قد کا ایک موٹا آدمی جسے یہ پروانہیں
تھی کہ وہ کتنا مضحکہ خیز دکھائی دے رہا ہے''(15)

انگریس جب کسی چیز یا بات سے متاثر ہوتا تو وہ اپنے جذبات کا اظہار بہت نرمی سے
کرتا۔ 1824ء میں جب چارلس دہم نے ایک تقریب میں اسے لیجن ڈی آنر عطا کیا تو
اس کے بعد انگریس نے میڈیلین کو ایک خط لکھا۔جس میں یہ لکھتے ہوئے ذرا بھی نہیں ہچکچایا کہ وہ
اس کی غیر موجودگی کی کمی کو کس قدر زیادہ محسوس کر رہا تھا۔اس نے لکھا کہ''جب تالیوں کی گونج
میں میرا نام پکارا گیا تو میری لرزتی ہوئی ٹانگیں اور میرا چہرہ یقیناً اس بات کی چغلی کھا رہا ہوگا کہ

میں اس وقت خود کو کتنا ناتواں محسوس کر رہا تھا۔ جب اپنے
اور بادشاہ کے درمیان فاصلے کو میں نے چل کر عبور کیا تا کہ میں اس سے وہ صلیب لے سکوں جو اس نے مجھے مرحمت کی تھی'' (16) میڈیلین کے نام اس خط میں انگریس نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ وہ اس موقعہ پر رو دیا ''اس موقعہ پر اگر تم بھی وہاں موجود ہوتیں تو رو دیتیں' اس وقت تمہیں یہ سب کچھ لکھتے ہوئے بھی میری آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔'' انگریس اس وقت 45 برس کا ہو چکا تھا اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد نرگسیت میں مبتلا ہو جانے والے کئی دوسرے مصوروں کی بجائے انگریس زیادہ گداز طبیعت ہو گیا تھا اور میڈیلین کیلئے اس کے دل میں نرمی اور جذبات کا وفور ابھر آیا تھا۔ اسی زمانے میں جب وہ ایک پورٹریٹ پر کام کر رہا تھا' انگریس نے اس شخص سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھے تا کہ ''اس کی آنکھوں میں نرمی کے جذبات ابھر آئیں'' (17)۔ انگریس کے اندر عورتوں کے جذبات کو مصور کرنے کی تڑپ پائی جاتی تھی۔ اس کی بنائی ہوئی پورٹریٹ اس لیے بھی خاص کشش رکھتی تھی کہ وہ عورتوں کے فیشن اور ان کی جذباتی کیفیات کو کینوس پر اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ 35 برس سے زیادہ اس کی شریک حیات رہنے والی میڈیلین کا جب 1849ء میں انتقال ہوا تو انگریس کی دنیا تہہ وبالا ہو گئی۔ وہ اس وقت 69 برس کا تھا۔ لیکن تین برس کی تنہائی نے اسے اتنا پریشان کر دیا کہ انگریس نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا۔ ایک بار پھر اس نے دوستوں کی مدد طلب کی اور Marcottes سے کہا کہ وہ اس کی شادی کرانے میں تعاون کرے۔ 15 اپریل 1852ء کو اس کی شادی ڈیلفائین رامیل سے ہوئی جس کی عمر 42 برس تھی اور جو انگریس سے تقریباً 30 برس چھوٹی تھی۔ یہ بات وہ ڈیلفائین کو اکثر یاد دلاتا تھا جو ایک کھاتے پیتے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ شادی سے پہلے وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی جو ورسائی میں مارگیج ایڈمنسٹریٹر تھا۔

یہ دوسری شادی بھی پہلی کی طرح پُرمسرت ثابت ہوئی۔ 1854ء میں انگریس نے اپنے

ایک دوست کو لکھا ''میں چند دوستوں کے سوا کسی سے نہیں
ملتا۔ یہ ان دوستوں کی مہربانی ہے کہ وہ میری موجودہ زندگی پر رشک کرتے ہیں۔ میری نہایت عمدہ بیوی اپنے آپ کو اس طرز زندگی سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہے۔ وہ میرے لیے تنہائی کا ماحول فراہم کرتی ہے اور تقریباً ہر شام وہ ہیڈن کی لازوال موسیقی کی دو دھنوں سے مجھے لطف اندوز کرتی ہے۔ وہ انہیں دل کی گہرائیوں سے پیش کرتی ہے اور کبھی کبھار میں بھی اس کا ساتھ دیتا ہوں''۔(18)

ازدواجی زندگی کی ان مسرتوں کے درمیان انگریس نے The Turkish Bath پینٹ کرنی شروع کی' اس کی وہ پینٹنگ جو اس کے بنائے ہوئے حرموں میں سب سے زیادہ شہوانی اور عریاں عورتوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ 1859ء کا سال تھا' اس مرتبہ نسبتاً زیادہ جوان
ڈیلفائین اس کے پہلو میں تھی اور جہاں تک حرم سے متعلق اس کے تصورات اور خیالات کا تعلق ہے تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ بے باک ہو چکا تھا۔ میڈیلین کے ساتھ یک زوجگی پر منحصر شادی کے دوران اس نے ایک کنیز کو پینٹ کرنے پر اکتفا کی تھی لیکن ڈیلفائین سے شادی کے بعد اس نے ترک حمام میں بیس سے زیادہ کنیزیں بنائیں جن میں سے صرف ایک ڈیلفائین سے مشابہہ تھی۔ آرٹ کے نقاد رابرٹ روزن بام کا کہنا ہے کہ ''ترک حمام کا منظر حقیقی اور تصوراتی دنیا سے مشابہہ ہے۔ ایک شہوانی اور لذت آمیز منظر جو ابھرے ہوئے آئینے کے اندر منجمد ہو گیا ہو۔ اس برہنہ عورت کا سر جو دائیں جانب پیش منظر میں ہے اور اس کا سر تکیے سے ٹکا ہوا ہے اس کے گداز بدن اور بھرے بھرے نقوش میں انگریس کی نئی بیوی ڈیلفائین رامیل پہچانی جاتی ہے۔''(19)

انگریس کو اپنی اس پینٹنگ کو مکمل کرنے میں تین برس لگے Edward Lucie-Smith جس نے Sexuality in WesternArt لکھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ پینٹنگ ''مشبہہ میں ٹھہری ہوئی لذت آمیزی کی خصوصی طور پر ایک پیچیدہ مثال ہے۔''(20) اس کے کہنے کے

مطابق ''ہر جا موجود، حاضر و ناظر نسائی بدن کی شان میں
Turkish Bath ایک مناجات ہے۔ اس میں ہر طرف عریاں بدن نظر آتے ہیں۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مصور کو خالی جگہوں سے خوف آتا ہے۔ یہ عورتیں جانوروں کی طرح ہیں اور غول کی صورت میں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ اور یہ خود کو مرد کی لذت اندوزی کے لیے تیار کر رہی ہیں (جنہیں آسودہ کرنے سے یہ کسی طور انکار نہیں کر سکتیں)۔ اس تصویر کی دوسری بات یہ ہے کہ اس میں تمام اشارے خفیہ نظر بازی کے ملتے ہیں۔ ہم ایسے منظر کو دیکھ رہے ہیں جو عمومی طور سے مردوں کی
نگاہوں کے لیے ممنوع ہیں۔'' (21)

شہزادہ نپولین کی بیگم شہزادی Clotilde ایک ایسی فرانسیسی عورت تھی جسے اس پینٹنگ The Turkish Bath سے اتنی رقابت محسوس ہوئی اور اتنی بہت سی برہنہ عورتوں سے وہ اس قدر گھبرائی کہ اس نے اپنے شوہر کو مجبور کر دیا کہ وہ اس پینٹنگ سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ شہزادہ نپولین نے وہ پینٹنگ انگریس کو واپس کر دی جس نے اس کینوس کو دوبارہ مصور کرنے میں گھنٹہ گھڑی کی دیر نہیں لگائی۔ اس نے اس پینٹنگ کو منقلب کر دیا۔ ایک عمودی لکیر کے ذریعے ایک حصے کو مدھم کر دیا اور بائیں جانب ایک دوسری لکیر سے اس میں اضافہ کیا۔ یہ تبدیلی اس لیے اہم تھی کہ عریاں عورت کے بدن کا بڑا حصہ جو دائیں طرف کے پیش منظر میں تھا وہ چھپ گیا اور اس کے برابر بیٹھی ہوئی عورت کا زاویہ بدل گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پیش منظر میں ایک میز پینٹ کر دی جو بیسن کے کنارے پر بیٹھی ہوئی عورت اور اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تمام عورتیں اس میز کی اوٹ میں آ گئیں اور اس کے بعد پردے ڈالے گئے'' (22)

ذرا سوچیے تو سہی کہ بدلی ہوئی پینٹنگ جسے فرانسیسی شوہر خریدنے سے ہچکچا رہے تھے اسے کس نے خریدا؟ ایک مسلمان ترک نے! ''1864ء تک یہ پینٹنگ انگریس کے نگار خانے میں ہی تھی۔ کچھ دنوں بعد اسے خلیل بے نے بیس ہزار فرانک میں خرید لیا۔ کمال بے فرانس میں ترکی

کا سفیر تھا۔'' (23)۔لیکن چار سال برس بعد 1868ء
میں ترک سفیر نے اس پینٹنگ کو ایک فرانسیسی خریدار کے ہاتھوں فروخت کر دیا جس نے اسے کسی اور کے ہاتھوں بیچ دیا۔ یہ 1911ء تھا جب یہ لوور میوزیم کی ملکیت بنی۔ میں سوچتی رہی کہ ترک سفیر نے اس پینٹنگ سے نجات کیوں حاصل کی؟ کیا یہ اس کی بیوی کے اصرار پر ہوا' یا اسے فرانسیسی فرانک کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ یا شاید اس عہد کے دوسرے ترک مردوں کی طرح وہ بھی حرم سے تنگ آ چکا تھا۔ جیسا کہ میں نے ساتویں باب میں بیان کیا ہے۔ 1860ء کی دہائی میں ترکی ایک اہم ترین ثقافتی انقلاب سے دوچار تھا جو مطلق العنان اسلام کو تہہ و بالا کرنے والا تھا۔

سلاطین عثمانیہ کی مطلق العنانیت اور ان کی عیاشیوں کو مغرب کی نو آبادیاتی فتوحات کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اس کی سامنے کی مثال 1830ء میں الجزائر پر فرانسیسی افواج کا قبضہ تھا۔ الجزائر عثمانی نو آبادی تھا۔ اس کے فرانسیسی مقبوضہ ہو جانے کے سانحے نے قوم پرستی کو تیزی سے ابھارا اور انتہا پسندانہ اصلاحی تحریکیوں کو جنم دیا۔ ان میں سب سے نمایاں ''ینگ ٹرکس'' تھے جو مسلمانوں کی فوجی شکست کو خلافت عثمانیہ کے مطلق العنان اداروں بہ طور خاص ''حرم'' کے ادارے کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ یہ ''ینگ ٹرکس'' تھے جنھوں نے 1860ء کی دہائی میں لڑکیوں کے سرکاری اسکولوں کی ترویج کی اور اس کے صرف 40 برس بعد 1909ء میں حرم کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے دیا اور اس کے ساتھ ہی عورتوں کی ہمت افزائی کی کہ وہ مختلف پیشوں سے وابستہ ہوں۔ کیا ترک سفیر خلیل بے اس بات سے شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ ایک نہایت مہنگے ''پیرس کے حرم'' کو اپنی ملکیت میں رکھے؟ کیا وہ اپنے وطن میں ''سیاسی طور پر درست'' ہونے کا تاثر دینا چاہتا تھا۔؟ یہ اس نوعیت کا سوال ہے جو رباط پہنچ کر مجھے اپنے ساتھ کام کرنے والے بن کیکی سے کرنا چاہیے۔ بن کیکی تمام بنیاد پرستوں کی طرح ''ینگ ٹرکس'' اور خاص طور پر کمال اتاترک سے نفرت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترک انقلاب کے بارے میں بہت زیادہ جانتا ہے جو 1920ء کی دہائی میں مکمل ہوا۔ اور اس کے بعد ترکی ایک جمہوریہ قرار پایا اور

کمال اتاترک اس کا پہلا صدر۔ سرکاری طور پر خلافت
1924ء میں ختم کی گئی۔

ترک انقلاب کے اثرات نے ساری اسلامی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس کی تقلید کرتے ہوئے مراکش میں لڑکیوں کا پہلا اسکول قائم ہوا۔ 40ء کی دہائی میں اسی اسکول میں میری تعلیم ہوئی۔ جس تعلیم کے بغیر میں ایک انتہائی مضطرب اور پریشاں حال جاہل مطلق ہوتی۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر میری تعلیم نہ ہوئی ہوتی تو میں کیا کرتی؟ میرے ذہن میں یہی خیال آتا ہے کہ پھر میں غیب داں ہوتی۔ ہاں میں مراکش کی سلطنت میں بہترین غیب داں اور پیش گوئیاں کرنے والی ہوتی۔ لیکن آخر غیب داں ہی کیوں؟ اس لیے کہ غیب داں امید بیچتے ہیں اور اپنے پاس آنے والوں سے بہ اصرار کہتے ہیں کہ ان کے اندر وہ صلاحیت موجود ہے جس کی عورتوں کو ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اپنی فضول زندگی میں معنونیت پیدا کرسکیں۔ ہاں میں امید بیچتی، امید میری دوا ہے اور میں اعلانیہ اس کا نشہ کرتی ہوں۔ مایوسی، صاحبان اقتدار اور بااثر لوگوں کی عیاشی ہے۔ میں تو مایوس ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

اس صورتحال کا سب سے حیران کن پہلو یہ ہے کہ سب سے پہلے ترکی اور اس کے بعد دوسرے مسلمان ملکوں میں عورتوں کی منقلب ہوتی ہوئی صورتحال کا شائبہ بھی مغربی مصوری میں نظر نہیں آتا۔ 1930ء میں ماتیس جب خاموش اور سرفگندہ ترک کنیزوں کو مصور کررہا تھا۔ ترک رسالوں کے سرورق پر انقرہ یونیورسٹی کی مسلح طالبات کی تصویریں چھپ رہی تھیں جو فوجی وردی میں تھیں۔ صبیحہ گوچن جو ترکی میں پہلی ہواباز عورت تھی۔ وہ 1930ء میں طیارے اڑا رہی تھی اور 1930ء کی پوری دہائی میں یہ ثریا اوغلو تھی جو وکیل تھی جو اپنے مؤکلوں کا مقدمہ عدالتوں میں لڑ رہی تھی۔ (24) خلیل بے جیسے امیر ترک کو پیرس نقل مکانی کرنی پڑی تھی تاکہ وہ حرم خرید سکے۔ انگریس نے حرم کی جن عورتوں کا تصور کیا اور لگاتار پچاس برس تک ان کی تصویریں بناتا رہا، وہ کوئی کام نہیں کرتی تھیں بے بسی کی حد تک وہ سرفگندہ تھیں اور تصویروں میں انہیں ہمیشہ

چار دیواری کے اندر دکھایا جاتا تھا۔ صوفوں پر نیم دراز
اور وہ بھی شرمسار کر دینے اور کمزور کر دینے والی برہنگی کے عالم میں۔ لیکن حرم ان کی تصوراتی ٬ بے بس اور کمزور عورتوں کا مشرق میں کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ مشرق میں جو کہ حرم٬ کثیر الزوجگی اور حجاب کی سرزمین ہے۔ وہاں کے مردوں نے ہمیشہ ادب اور مصوری دونوں شعبوں میں ان عورتوں کے خواب دیکھے ہیں جو حاکمانہ مزاج رکھتی ہوں۔ اپنی بات منوانا جانتی ہوں٬ جن پر قابو نہ پایا جاسکتا ہو اور جو متحرک ہوں۔ عربوں نے الف لیلہ ولیلہ کی شہرزاد کا تصور باندھا٬ ایرانیوں نے شیریں جیسی مہم جو شہزادی کی تصویریں بنائیں جو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر بر اعظموں کے درمیان جنگلی اور خونخوار جانوروں کا شکار کھیلتی تھی اور مغل یا وسط ایشیا کے ترکستانی منگولوں نے مسلم دنیا کو نہایت دلکش٬ شہوت انگیز تصویریں دیں۔ جن میں طاقتور٬ آزاد روش اور خود مختار عورتیں ہیں۔ جبکہ نازک اندام اور غیر محفوظ نظر آنے والے مرد ہیں۔ اس لیے ہمیں اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ تیزی سے جدید ہوتے ہوئے ترکی کے رسائل و جرائد کے سرورق پر ہوائی جہاز اڑاتی ہوئی اور بندوق سنبھالتی ہوئی عورتوں کی تصویریں بار بار شائع ہوتی تھیں۔

مسلم مصوروں کے خواب و خیال کی دنیا پر کس قسم کی عورتیں چھائی ہوئی تھیں؟ وہ جب حسن کا تصور باندھتے تھے تو کس وضع کی عورتوں کی تصویریں بناتے تھے؟ یہ وہ سوالات تھے جن کے جواب مجھ سے کلائر اور جیکوئس چاہتے تھے٬ وہ انگریس اور اس کے جذبات کے بارے میں میرے لامتناہی سوالات سے تھک چکے تھے اور اب ان کی توپوں کا رخ میری طرف تھا۔

(11)
جنگجو شیریں عشق کے لیے شکار کرتی ہے

مینا طور مصوری میں مسلمان مردوں نے کن عورتوں کو مصور کیا ہے؟ کیا وہ کہانیوں کے کردار ہیں' داستانی ہستیاں ہیں یا جیتی جاگتی ملکہ اور شہزادیاں ہیں؟ کیا اسلام میں مصوری کی روایت پائی جاتی ہے؟ کیا اسلام میں انسانی شبیہوں کو بنانے کی ممانعت نہیں ہے۔؟ میں نے جب جیکوئس کو اسلامی مینا طوری تصویروں میں نسائی شبیہوں کے بارے میں بتایا تو یہ وہ سوالات تھے جیکوئس نے جن کی مجھ پر بوچھاڑ کر دی۔

اسلامی دنیا مصوری کی ایک شاندار روایت رکھتی ہے۔ جس میں ایرانیوں نے اپنے فن کو اوج کمال پر پہنچا دیا تھا۔ عشق کا جشن منایا جاتا تھا' رزمیہ بحری مہمات اور جنگوں کے مناظر مصور کیے جاتے تھے اور ان میں عورتوں کی نمائندگی بھرپور طرح ہوتی تھی۔ اکثر انہیں جنگجویانہ انداز میں دنیا کو بدلنے اور مسلسل مہمیں سر کرتے دکھایا جاتا۔ وہ شہزادی شیریں کی طرح گھوڑوں پر سواری کرتیں جیسا کہ مثنوی ''خسرو شیریں'' میں بیان کیا گیا ہے۔ یا عہد نامہ قدیم کی کہانی یوسف میں زلیخا کو اونٹ پر سفر کرتے دکھایا گیا ہے۔ تاہم اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں۔ آیئے اس سوال سے نمٹتے ہیں کہ اسلام میں انسانی شبیہیں بنانے کی یکسر ممانعت ہے۔

اسلام میں شبیہوں پر پابندی کا بنیادی سبب یہ تھا

کہ مکہ کے عبادت خانے میں بت پرست عرب 360 بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ آٹھویں صدی کے مصنف ہشام ابن الکلبی جو اُن گنے چنے مورخین میں سے ایک ہے جنہوں نے قبل اسلام کی عرب صنم پرستی کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس میں سے کچھ 'عنقب' یا سادہ بت تھے اور کچھ ''عقنم' تھے یعنی ایسے مجسمے جو انسانی شکل وصورت رکھتے تھے۔ (1) قبل اسلام کے عرب اپنے پسندیدہ دیوتاؤں کی مٹی کی چھوٹی شبیہیں بناتے تھے اور ان مجسموں کو ردِّ بلا کے طور پر اپنے گھروں میں رکھتے تھے۔ یہ ان کے گھریلو طریقۂ عبادت میں شامل تھا۔ وہ جن کی پوجا کی جاتی تھی ان میں سے بہت سی دیویاں تھیں اور شاید اسلام میں شبیہوں اور قلمی تصویروں پر پابندی اور ممانعت کی یہ ایک مزید وجہ ہو۔ رسولؐ کے اپنے قبیلے تین عرب دیویوں کی پرستش کرتے تھے جو ال لات' ال عزہ اور منات تھیں۔

رسولؐ نے جب مکہ فتح کیا تو انہوں نے تمام دیوی' دیوتاؤں کو تباہ و برباد کر دیا' کعبہ کو پاک کیا اور اعلان کیا کہ صرف ایک خدا کی عبادت ہونی چاہیے۔ (2) قرآن کی وہ آیت جو شبیہوں کی ممانعت میں نازل ہوئی ہے وہ تین دوسرے گناہوں سے بھی روکتی ہے۔ یہ شراب' جوا اور مستقبل کے بارے میں پیش گوئی ہیں۔ ''اے ایمان والو! تیز شراب (خمر) (5:89)

تاہم' یہ ہم سب جانتے ہیں کہ سارے مسلمان فرشتے نہیں ہیں۔ ان میں سے کچھ شراب پیتے ہیں' کچھ جوا کھیلتے ہیں اور ان میں سے کچھ' خاص طور سے عورتیں فال نکلواتی ہیں اور جادو ٹونا کرتی ہیں اور کچھ مسلمان مصوری کرتے ہیں اور انسانی شبیہیں بناتے ہیں۔ کچھ قومیں جو مسلمان ہوئیں ان میں سے ایرانی مصوری کی ایک شاندار روایت رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے نئے مذہب کی وجہ سے انسانی شبیہیں بنانے سے کنارہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ایرانیوں نے مسلم تہذیب کو اپنے بے مثال ثقافتی ورثے سے روشناس کرایا اور مالا مال کیا۔ انہوں نے عربوں اور دوسری قوموں کو بیناطوری مصوری سے آشنا کیا۔ ایرانی مصوروں کو اکثر ترک اور مغل درباروں

میں آنے اور مذہب و مطلاّ کتابیں تیار کرنے والے نگار
خانوں میں کتابوں کو مصور کرنے کی دعوت دی جاتی۔

ساری مسلم دنیا میں انسانی شبیہوں کو بنانے پر پابندی عائد نہ کر سکنے کی دو وجوہ اور ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے منطقی بنیادوں پر سیکولر آرٹ اور مذہبی آرٹ میں ایک حدِ فاصل قائم کی۔ چرچ کے انداز آرائش سے اختلاف کرتے ہوئے مسجد میں کبھی بھی انسانی شبیہیں نہیں بنائی گئیں لیکن امراء کے محلات میں مینا طوری تصویروں کے منہ مانگے دام دیئے جاتے تھے اور بعض بااثر اور طاقتور خلفاء تو ایسے بھی تھے جو اپنے ذاتی نگار خانوں میں مصوروں کو ملازم رکھتے تھے۔ مغرب کی روایت کے برعکس مسلمان امراء اپنی بنوائی ہوئی ان تصویروں پر اپنے عوام کی نظر بھی نہیں پڑنے دیتے تھے اور آج بھی فن کے بیشتر اسلامی نمونے دولت منداور بااثر لوگوں کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

میوزیم کا تصور بھی خالص مغربی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا میں میوزیم کو سرکاری طور پر کوئی خاص سرپرستی حاصل نہیں، ان میں سامان بہت کم ہے اور وہ عموماً ویران رہتے ہیں مسلمان ملکوں میں انسانی شبیہوں پر مشتمل مصوری کے نمونوں کی موجودگی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام میں کیتھولک چرچ کی طرح کا مقدس پاپائی نظام موجود نہیں جو ان روایات کی سختی سے پیروی
کرواسکے۔ پوپ کی طرح اسلام میں راسخ العقیدہ مذہبی حاکمیت رکھنے اور راسخ العقیدگی کو نافذ کرانے والی کوئی شخصیت موجود نہیں۔

آیئے اب اس پر بات ہوجائے کہ مسلم مصوری میں ہمیں عورتوں کی کیسی شبیہیں دکھائی دیتی ہیں؟ ایسی ثقافتوں میں جہاں خدا نے انسانی شبیہوں کو بنانے کی ممانعت کی ہے وہاں جذبات واحساسات پر اور اقتدار کے دروبست پر کیا گزرتی ہے، جہاں مرد ممانعت کے باوجود اس بات کی ہمت کرتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور تصورات کی دنیا کی تصویر کشی کریں۔ ان کے خواب و خیال کی عورتیں ان باہمت مسلمان مردوں میں وہ کون سے جذبات بیدار کرتی ہیں

جنہیں وہ ان کی شبیہیں بناتے ہوئے مصور کرتے ہیں؟

کیا یہ مرد شریعت کے اصولوں کا احترام نہیں کرتے ہیں جو حرم کا تصور پیش کرتی ہے اور مرد اور عورت کے مخلوط اجتماع پر پابندی عائد کرتی ہے۔؟ یا وہ ان احکامات کو مسترد کر دیتے ہیں؟ نہایت فصیح البیان عرب مصنف بن شیخ نے اس بارے میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ماضی اور حال دونوں پر صادق آتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''عشق نئے افق آشکار کرتا ہے اور یقینی طور پر طے شدہ معاملات کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ عشق میں گرفتار مرد خود کو نئے سرے سے دریافت اور ایجاد کرتا ہے اور وہ نہیں رہتا جو کہ وہ تھا۔ ایک عورت عشق میں اپنی ان نئی جہتوں کو دریافت کرتی ہے جن کی اس سے آرزو کی جاتی ہے۔ عشق میں آزادی کا تصور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہر بات پر غالب آ جاتا ہے اور انسانی ذات کی تمام حدود قیود سے کہیں آگے چلا جاتا ہے۔''(4)

مسلم مصوری میں مثالی نسائی حسن جس طرح مصور کیا گیا ہے اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی توجہ شہزادی شیریں پر مرکوز کرنی چاہیے جو کہ ایک خالص سیکولر ہیروئن تھی اور مسلم مصوری میں ہمیں سب سے زیادہ اسی کی شبیہیں ملتی ہیں۔ شہرزاد کی طرح شیریں بھی ایک ایرانی نام ہے، شہرزاد اگر ادبی ہیروئن ہے تو فن مصوری میں شیریں اس کی مدمقابل ہے۔ شیریں ایک گوشہ گیر اور حجاب در حجاب رہنے والی شہزادی ہے جو عشق میں گرفتار ہوتے ہی اس حرم کو چھوڑ دیتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اسے اکثر یوں دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے رہوار پر سوار تن تنہا جنگلوں سے گزر رہی ہے اور شہزادہ خسرو کے تعاقب میں ہے یا وہ کسی جھنڈ میں چھپے تالاب میں نہا رہی ہے اور اس کا وفادار گھوڑا اس کا پہرے دار ہے۔ اور آخر کار جب وہ شہزادہ خسرو کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو ان دونوں کو شانہ بشانہ جنگلی جانوروں کے شکار میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ خسرو جب اسے متاثر کرنے کے لیے ایک شیر کو اپنی شمشیر سے شکار کرتا ہے تو اسی لمحے شیریں جواباً ایک گورخر کو اپنے نیزے سے چھید دیتی ہے۔ (5) اور اگر ہم شیریں کی مہمات کا اندازہ ان مینا طور تصویروں سے لگائیں تو ہمیں اس کی پیشانی پر شکن بھی نظر نہیں آتی۔ اس کی

جگہ اگر میں ہوتی تو ان جنگلی جانوروں کا یوں مارا جانا مجھے

مضطرب کر دیتا لیکن اس کے خدوخال پُرسکون ہیں اور اس کا دل ان کے لیے خون نہیں ہو رہا ہے

میں جب دوبارہ لوور گئی تو اس وقت اپنے بے ساختہ قہقہے کو نہ روک سکی جب میں نے انگریس کی کنیزوں سے مسلم مینا طوری تصویروں کا موازنہ کیا۔ ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں نے تصور باندھنے کی کوشش کی کہ Bois de Boulogne کے جنگلوں میں انگریس اگر شہزادی کے روبرو آ جاتا تو کیا ہوتا؟ کیا اس کی تصویریں بنانے کے لیے انگریس شیریں کو اس کے گھوڑے اور اس کے تیروں سے محروم کر دیتا؟ اور کیا وہ اس کے تن سے اس کا لباس اور ریشمی کفتان بھی اتار کر ایک طرف رکھ دیتا؟ اور ایمانوئل کانٹ پر کیا گزرتی جس نے کہا تھا کہ علم و دانش عورت کو اس کے حسن سے محروم کر دیتے ہیں۔ تو کیا ایک عالم و فاضل عورت کی ٹھوڑی پر ڈاڑھی

اُگ آنی چاہیے؟ میرے لیے یہ تصور ہی اتنا مضحکہ خیز تھا کہ حسین و جمیل شہزادی شیریں کی ٹھوڑی پر مصنوعی داڑھی لٹکی ہوئی ہے کہ میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ یہ اتنی نامناسب بات تھی کہ لوور کی پہلی منزل کے اس نیم تاریک کمرے میں جہاں انگریس کی La Grande Odalisque قید ہے اور جہاں ہر وقت سکوت طاری رہتا ہے۔ وہاں ایستادہ شاندار وردی میں ملبوس محافظ لپکتا ہوا میری طرف آیا اور اس نے کہا کہ یا تو میں بہت آہستہ ہنسوں یا فوراً یہاں سے نکل جاؤں۔ میں نے اس کے دوسرے مشورے پر عمل کیا۔ اور اپنا سر بلند رکھتے ہوئے ریوڈی ریولی کی جانب نکلنے والے راستے سے باہر نکل گئی۔

''خسرو اور شیریں'' کا عشق فارسی کے مشہور شاعر نظامی (1209-1140) کے ''خمسہ'' کا ایک حصہ ہے۔ اس عشق کو ان گنت مسلمان مصوروں نے اپنی مصوری کا موضوع بنایا ہے۔ اس میں ایرانیوں، ترکوں، مغلوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ شیریں اور اس کا معشوق خسرو دونوں کا تعلق دو مختلف ملکوں سے تھا۔ خسرو بادشاہ ہرمز کا بیٹا اور ایرانی شہزادہ تھا۔ جبکہ شہزادی شیریں آرمینائی

ملکہ کی بھانجی تھی۔ مسلمان داستانوں اور اساطیری روایتوں کا یہ ایک روایتی انداز ہے۔ شاید اس طرح ان کے راوی اپنے پڑھنے والوں کو اس تکثریت اور کثرت وجودیت کا عادی بنانا چاہتے ہیں جو مسلم معاشرے کے لیے ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں کیسے جان سکے؟ بہ طور خاص ایک ایسی صورتحال میں جبکہ شہزادی شیریں اپنی خالہ کے پُر آسائش اور حجاب در حجاب ماحول میں رہتی تھی۔ پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ خسرو تھا جو شیریں کے عشق میں پہلے گرفتار ہوا جو اس کو خواب میں نظر آئی تھی۔ ''اس نے خواب دیکھا کہ وہ دنیا کے تیز ترین رہوار شب دیز پر سواری کرے گا اور شیریں نامی ایک غنچہ دہن، سیمیں بدن حسینہ کو جیت لائے گا اور اس سے شادی رچائے گا۔''(6) اس کے چند دنوں بعد خسرو کا ایک دوست شاپور جو آرمینیا کی سیر کر آیا تھا اس سے خسرو نے ایک حسین شہزادی شیریں کا ذکر سنا جو آرمینیائی ملکہ کی بھانجی تھی اور اس کے محل میں رہتی تھی۔ شاپور کو جب اس کا اندازہ ہوا کہ شہزادہ خسرو نے جس حسینہ کو خواب میں دیکھا تھا، اس کے والہانہ عشق میں گرفتار ہے تو اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنا کر واپس آرمینیا کا رخ کیا ''شاپور نے پیڑوں پر خسرو کی قلمی شبیہیں آویزاں کرا دیں اور یوں شیریں کو خسرو کے اشتیاق میں گرفتار کر دیا اور اس بات کا اشارہ بھی دے دیا کہ وہ ایران میں اس سے کہاں مل سکتی ہے۔''(7) اور سوچیے پھر کیا ہوا؟ حرم میں رہنے والی پردہ دار شہزادی لمحے بھر کو نہ ہچکچائی، وہ زقند لگا کر دنیا کے تیز ترین رہوار پر سوار ہوئی اور عشق کی تلاش میں بے تابانہ اور ناقابل مزاحمت جذبے سے سرشار سفر پر روانہ ہوئی۔'' 14 دن اور 14 راتوں تک سفر میں گزارنے کے بعد وہ تھکن سے چور اور راستے کی دھول میں اٹی ہوئی تھی جب اسے پانی نظر آیا اور وہ اس میں نہانے کے لیے رک گئی۔''(8)۔ کیا کمال لمحہ ہے اور وقت میں تھمی ہوئی کیا غیر معمولی ساعت ہے کہ ایک گوشہ گیر عورت ایک مہم جُو کا روپ اختیار کرتی ہے۔ اجنبی جنگلوں میں تنہا ہفتوں سفر کرتی ہے اور پھر ایک پرشور دریا میں نہانے کے لیے رک جاتی ہے۔ جیسے یہ روزمرہ

کی بات ہے۔اس وقت سے اب تک مسلمان مینا طوری
مصوروں نے اس ویرانے میں شیریں کے نہانے کو جشن کا سماں بنا دیا ہے۔

ادھر ایران میں کچھ ایسے سیاسی حالات پیش آئے کہ خسرو کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا اور اس نے آرمینیا کا رخ کیا۔ وہ سفر میں تھا جب ناگہاں اس نے حسن کو نہاتے دیکھا۔ قریب ہی کھڑا ہوا اس کا سر سے پیر تک آراستہ و پیراستہ رہوار اس کا منتظر تھا اور اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ نہانے والی

طبقہ امراء سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ منظر کہ ''خسرو نہاتی ہوئی شیریں کو دیکھ رہا ہے''۔مسلم مینا طوری مصوری کا ایک اہم امتیازی نشان ہے۔ اس منظر میں ہیروئن کو ایک پراسرار شہ سوار عورت کے طور پر دکھایا گیا ہے جو گھنے جنگلوں کے ایک دریا میں تیرنے میں مصروف ہے۔(9) لیکن اس پہلی ملاقات میں شیریں اور خسرو ایک دوسرے سے کلام نہیں کرتے۔ اگر یہ دونوں بات کر لیتے تو ہم اس شاندار داستان سے محروم ہو جاتے۔''اس کے حسن سے ششدر ہو کر خسرو دبے قدموں آگے بڑھتا ہے۔ شیریں چونک کر خود کو اپنی لمبی زلفوں میں چھپا لیتی ہے۔ لباس پہنتی ہے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتی ہے۔ خسرو اس سیمیں بدن کو حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اس کی اصلیت سے آگاہ نہیں ہوتا۔ نہ شیریں خسرو کو پہچانتی ہے تاہم وہ بعد میں یہ سوچتی ضرور ہے کہ وہ وجیہہ اور شاندار سوار یقیناً کوئی شہزادہ تھا۔'' (10) یوں عشق کے آزار میں مبتلا دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور مختلف سمتوں میں سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ آفاقی تصور ہے جو رنج والم سے بھرپور ہے۔ ہم اپنی مختصر سی زندگی میں جدائی کا ہی سفر کرتے رہتے ہیں خواہ ہم ہر رات ایک ہی بستر پر اپنے شریک سفر کے ساتھ بسر کریں۔ ہم اپنے ذہن میں ایک بہتر شریک کا خیال رکھتے ہیں۔ ایک مثالی شخص کا تصور جو خوشی کے امکان کو دھندلا دیتا ہے۔

کسی شبیہ یا تصویر کے عشق میں گرفتاری وہ داستان ہے جو ہم سب کے ساتھ پیش آتی ہے۔ ہم اپنی نوعمری کے ذہن میں ایک خاکہ بناتے ہیں اور پھر خوشی کی تلاش میں اپنے جذباتی

سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ دنوں اور راستوں کو گزارتے
ہیں۔ دریاؤں اور سمندروں کو عبور کرتے ہیں اور اس نامعلوم مثالی وجود کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو ہمارے خیالیہ سے قریب ترین شباہت رکھتا ہو۔ مسلم مصوری اور داستان سرائی میں عشق کے معاملات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ مسرت اس
میں پنہاں ہے کہ اپنے سے مختلف کی تلاش میں دور دراز کا سفر کیا جائے۔ عشق میں گرفتار ہونا' حدود کو عبور کرنے اور خطرات کو مول لینے کا دوسرا نام ہے۔

کسی شبیہ کے عشق میں گرفتاری وہ خاص موضوع ہے جس کی بازگشت ہمیں الف لیلہ ولیلہ کی کئی داستانوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ داستان جس کا عنوان ہے۔ ''شہزادہ جو ایک تصویر کے عشق میں گرفتار ہوا' اس داستان میں ایک ایرانی شہزادہ ایک سیلونی عورت کی تصویر پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے کا مطلب طول وطویل سفر ہے اور اس کا اندازہ ہمیں داستان کے اس اختصاریے سے ہوتا ہے کہ ''ایک نوجوان شہزادہ اپنے باپ کے خزانے میں داخل ہوا' وہاں اس کی نظر صنوبر کے ایک صندوق پر پڑی جس پر موتی' ہیرے' زمرد اور دوسرے جواہر جڑے ہوئے تھے۔ صندوق میں چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے چابی گھمائی' صندوق کو کھولا تو اس میں ایک نہایت حسین وجمیل عورت کی تصویر رکھی تھی جس پر وہ پہلی نظر میں ہی عاشق ہو گیا۔ اس تصویر کی پشت پر اس عورت کا نام تحریر تھا' اس کے نام سے آشنا ہو کر وہ ایک دوست کے ساتھ اسے ڈھونڈنے کے سفر پر نکل پڑا۔ بغداد میں ایک بوڑھے نے اسے بتایا کہ اس عورت کا باپ ایک زمانے میں سیلون کا بادشاہ تھا وہ اس کی تلاش میں چلتا رہا اور راستے میں اسے کئی ایسی مہموں سے پالا پڑا جن کے بارے میں کسی نے کبھی سنا بھی نہ تھا۔'' (11)۔
ایک عورت اور مرد کے درمیان عشق کی ضرورت ہے کہ وہ اجنبی ثقافتوں کی خطرناک آمیزش سے جنم لے۔ ان کے درمیان صنف کا فرق ایک کائناتی سرحد ہے۔ ایک وجودی حد مسلم سائیکی میں عشق کرنے کا مطلب ہے کہ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی حدوں کو عبور کرنے کا سبق سیکھنا

ہے تا کہ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کی مشکلات پر
قابو پایا جاسکے۔اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانیت کی فراوانی' تکثیریت اور اللہ کی بنائی ہوئی مخلوق کے تنوع کو سمجھا جاسکے۔قرآن کی ایک آیت جو مجھے بے حد محبوب ہے اور جس کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے کہ اس میں کہا گیا ہے کہ لوگو!.ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا،اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔49:12

عربی کا لفظ ''عرفہ'' جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے اس کا مطلب ''جاننا'' ہے۔یہ اس کا فاعل ''عارف'' ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسا شخص جسے ایک گروہ نے اپنا رہنما کیا ہو۔ کیونکہ اس نے ان چیزوں کے بارے میں لوگوں سے سوالات کر کے علم حاصل کیا ہو جن کے بارے میں وہ نہیں جانتا تھا۔(12)۔مسلمانوں میں مختلف حوالوں سے چیزیں سیکھنے پر بطور خاص اصرار کیا جاتا ہے۔اس بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام صحرا سے اٹھا جو کہ آج سعودی عرب کہلاتا ہے اور اس کے شہری خوشحال ہیں۔

مکہ کی خوشحالی تجارت کا مرکز ہونے کی وجہ سے تھی۔مسلم تقویم کے ابتدائی برسوں میں مسافر مسلسل ان راستوں سے گزرتے جو افریقا' ایشیا اور یورپ کو ایک دوسرے سے ملاتی تھیں۔ بیشتر مغربی لوگ اسلام کا رشتہ نسل پرستی اور جہاد سے جوڑتے ہیں لیکن اس خیال کے برعکس یہ مذہب عرب سے انڈونیشیا تک تجارتی راستوں کے ذریعے پھیلا' مسافر سفر کرتے رہتے ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور ایک دوسرے کی ثقافت سے سیکھتے مورخ مارشل ہاجسن نے لکھا ہے کہ ''945ء (خلافت عباسیہ) کے بعد 5 صدیوں کے دوران خلافت کا پرانا معاشرہ ایک بین الاقوامی معاشرے میں تبدیل ہوگیا جو کہ لسانی' ثقافتی' تہذیبی اعتبار سے مسلسل پھیل رہا تھا اور ان پر مختلف آزاد فرمانروا حکومت کررہے تھے۔یہ معاشرے کسی ایک سیاسی دروبست یا ایک زبان یا ثقافت کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نہیں تھے۔اس کے باوجود یہ شعوری طور پر اور اپنے اثرات کے اعتبار سے ایک تاریخی کُل رہے۔یہ عالمی اسلامی تہذیب اپنے زمانے میں

یقینی طور پر اس کرۂ ارض کی سب سے زیادہ پھیلی ہوئی اور

با اثر سماج تھی۔''(13) دل کو لبھانے اور مالا مال کر دینے والا یہ تنوع ایک پُر اثر پیغام تھا جو بہت سی مسلم خیال آرائیوں میں نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں یہی وہ اثرات ہیں جن کی بناء پر میرے آس پاس کی آباد دنیا کے لوگ بے پناہ غربت اور ناخواندگی کے باوجود انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی میں اس قدر گہری دلچسپی رکھتے ہیں(14)

تاہم مراکش کی جھونپڑ پٹیوں اور مضافاتی آبادیوں میں 'سائبر کیفے' کے غیر متوقع طور پر برساتی کھمبیوں کی طرح پیدا ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میرے یہاں کے نوجوان اجنبی لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں تاکہ وہ ترک وطن کے لیے ویزا حاصل کر سکیں۔(15)

مسلم دنیا کی ابتداء میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کو دریافت کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جنس مخالف کے بارے میں خواب بُنے جائیں۔ سند باد کسی جزیرے پر پہنچتے ہی عشق میں گرفتار ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ اور کثیر الزوجگی کے اپنے حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ہی شادی رچا لیتا تھا۔ ایک غیر ملکی عورت یا مرد کے عشق میں گرفتار ہو جانا مسلم داستانوں' حکایتوں اور تصویروں کا غالب خواب ہے۔ کبھی کبھی تو کسی مرد کے عشق میں گرفتار ہونے والی عورت کی اجنبیت کا ڈرامائی عنصر اجاگر کرنے کے لیۓ وہ ایک غیر انسانی مخلوق بیان کی جاتی ہے اور جو ''سمندر کی گل نار'' کے نام سے معروف ہے۔ اس میں بھی ایسا ہی ہوا کہ گل نار ساحل سمندر پر غلاموں کی تجارت کرنے والے ایک شخص کے ہاتھ لگتی ہے جو اسے اس ملک کے سلطان کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔ بادشاہ گلنار پر دیوانگی کی حد تک فریفتہ ہو جاتا ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گل نار کی عادتیں اور رویے بہت مختلف ہیں۔ گل نار حالت وصل میں اس پر بے حد مہربان ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی اس کے رویے بہت پُراسرار ہوتے ہیں۔ یہ بہت معمولی باتیں' بہت غیر اہم رویے ہوتے ہیں۔ جن کی بناء پر مرد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان

سے ہمکنار ہونے والی عورت اور ان کے درمیان کس قدر
زیاد فاصلہ ہے۔گل نار کے معاملے میں یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ یہ محسوس کر لیتا ہے کہ کبھی کبھی سمندر اسے بے پناہ چاہنے اور جان چھڑکنے والے بادشاہ سے کہیں زیادہ لبھاتا ہے۔'' شام میں جب بادشاہ اس کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ دریچے کے پاس کھڑی ہے اور سمندر کو تک رہی ہے۔ وہ اس کی موجودگی سے آگاہ ہو چکی تھی لیکن اس نے نہ بادشاہ کی طرف توجہ کی' نہ اس کی تعظیم و تکریم کی۔ وہ اسی طرح سمندر کو دیکھتی رہی اور سر گھما کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔''(16)۔ ہاں۔اسلام کے لیے نسائیت کے عجیب اور غیر متوقع رویے ایک ایسا معاملہ ہیں جو اسے حیرت میں مبتلا کرتے ہیں اور وہ دنیا کا واحد مذہب ہے جو شریعت کی رو سے عورتوں پر گوشہ گیری اور الگ تھلگ رہنے کے قوانین لاگو کرتا ہے۔

مسلم مینا طوری تصویروں کی عورتیں جو عشق میں مبتلا ہیں' وہ کسی نہ کسی مسئلے اور مشکل سے دوچار رہتی ہیں۔جنہیں حل کرنے کے لیے وہ عموماً کشتیوں کا سہارا لیتی ہیں اور سمندروں کو عبور کرتی ہیں۔ شیریں بھی یہی کرتی ہے ہم مختلف تصویروں میں اسے سمندر کا سفر کرتے دیکھتے ہیں۔ان مینا طوری تصویروں میں کشتی کا سارا عملہ عورتوں پر مشتمل ہے۔(17) یہ بات مجھ ایسی عورت کو قطعاً حیران نہیں کرتی ۔ میں ایک روایتی گھرانے میں پلی بڑھی۔ جہاں میری ناخواندہ دادی یاسمینہ نے میرے تصورات کو زمانوں پہلے غالیہ کے بارے میں کہانی سنا کر مہمیز کیا تھا۔ غالیہ' شیریں کا مراکشی روپ تھی۔ تین سے تیس برس کی عمر تک جب ٹیلیوژن مراکش پہنچا اور تمام نانیاں' دادیاں خاموش کر دی گئیں اس وقت تک میں نے غالیہ کی کہانی بار بار سنی تھی۔ روزانہ رات ہوتی اور غالیہ ''سات سمندروں' سات دریاؤں اور سات رود باروں'' کو عبور کرتی اور ان مشکلوں کو حل کر لیتی جو ابتداء میں نا قابل حل محسوس ہوتی تھیں۔ 1987ء میں جس روز میں نے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے کاسابلانکا سے ملائیشیا جانے والے طیارے میں قدم رکھا تو مجھے غالیہ یاد آئی اور میں نے محسوس کیا کہ اگر دادی یاسمینہ زندہ ہوتیں تو وہ میرے اس سفر کی تائید

کرتیں۔ ٹیلی وژن آنے سے پہلے میری مسلم دنیا میں

ایک چھوٹی لڑکی کو یہ سبق سکھایا جاتا تھا کہ دنیا بہت مشکل جگہ ہے اور ایک داستانی شہزادی کے خیالی محل تک پہنچنے کیلئے تمہیں غالیہ کی طرح کمالات دکھانے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ کیونکہ کسی چیز کا حصول نہ آسان ہے اور نہ حتمی۔ بوڑھی عورتیں چھوٹی لڑکیوں سے کہتیں ''تمہیں ایک لمحے کی خوشی کو چھیننے کے لیے بہت محنت کرنی ہوگی۔'' ہاں یقین کیجئے مجھے کبھی نہیں کہا گیا تھا کہ زندگی میرے لیے آسان ہوگی۔ نہیں، یہ کبھی نہیں کہا گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ صرف ایک لمحے کی خوشی حاصل کرنے کے لیے بہت کام کرنا پڑتا ہے اور اپنی توجہ اس کام پر مرکوز رکھنی پڑتی ہے۔ مجھ سے یہ بات کبھی نہیں کہی گئی تھی کہ کوئی شہزادہ مجھے خوشیاں دے گا۔ اس کی بجائے مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں نے اپنے کام پر مکمل توجہ دی تو اپنی خوشی میں خود تخلیق کر سکوں گی۔ اور اگر شہزادہ مجھے پسند آیا تو میں اسے مسرت دے سکوں گی اور وہ مجھے خوشیاں دے سکے گا۔

مسلم داستانوں اور اساطیر میں شہزادیاں، ہمیں مشکلات کا شکار کرتی ہیں۔ اگر ایک عورت سے دیوانہ وار عشق کیا جا رہا ہے اور اگر وہ ایک محل میں عیش وعشرت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ تب بھی عین ممکن ہے کہ وہ شہزادہ سیاسی مشکلات سے دوچار ہو جائے اور اس کا شاہی دور اختتام پذیر ہو جائے۔ ایک عورت کو ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ وہ زقند لگا کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو اور اجنبی سرحدوں کو عبور کرے۔ غیر یقینی صورتحال عورت کا مقدر ہے۔ ابھی شیریں کی کہانی کو سمیٹنا بھی ہے۔ تو یہ جانیے کہ وہ اجنبی سرزمینوں سے اپنے گھوڑے پر گزرتی ہے۔ مسافت اس کے رہوار کے سموں کے نیچے سے گزرتی چلی جاتی ہے، وہ مختلف اور متعدد غیر متوقع مہمات کا سامنا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خسرو سے ملتی ہے اور اس سے شادی کر لیتی ہے۔ اس کی لامحدود توانائی مسلمان مصوروں کے ساتھ ساتھ مسلمان عورتوں کے لیے بھی سرچشمۂ فیض رہی ہے۔

عارف وسالک وہ عورتیں ہیں جن سے عشق کیا جائے اور ان کا متحرک ہونا، سفر میں رہنا،

صوفیا کے لیے ایک مرکزی خیال ہے۔ ابن عربی عشق
میں گرفتار عورت کو''طیر'' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ جس کے لغوی معنی ہیں ''جسے پر عطا ہوئے'' (18)۔ یہ وہ خیال ہے جس کی مسلم مینا طوری مصوروں نے بارہا نقاشی کی ہے۔ تیرہویں صدی میں جب ابن عربی نے مکے کا طویل سفر اختیار کیا تو اس دوران اس نے عشق کے بارے میں غوروفکر سے کام لیا۔عشق وہ غیر معمولی احساس جو انسانوں کو یہ موقع عطا کرتا ہے کہ وہ الوہی کاملیت تک پہنچ سکیں۔(19) یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ ابن عربی اور اس کے بعد آنے والے صوفی عارفوں نے ہمیشہ اس میں مشکل محسوس کی ہے کہ الوہیت سے متاثر ہوکر عشق میں گرفتاری اور کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہونے کی کیفیت کے درمیان لکیر کیسے کھینچی جائے۔

ابن عربی 1155ء میں مسلم ہسپانیہ کے شہر مرصیہ میں پیدا ہوا' اس نے مکے کا سفر اختیار کیا۔ جو چھ ہزار میل دور تھا۔ وہ روحانی مرشدوں کی تلاش میں نکلا تھا جو اسے مرد کامل بنا سکیں۔ اس نے

یہ سوچا بھی نہ تھا لیکن ہوا کچھ یوں کہ جب وہ اپنے استاد امام ابن رستم کے گھر میں ایک طالبعلم کے طور پر داخل ہوا تو عشق میں گرفتار ہوگیا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''میں نے جب 585ھ (1206ء) میں مکے میں عارضی قیام کیا تو وہاں ملاقات ایک نہایت اعلیٰ گروہ سے ہوئی جس میں عالم وفاضل اور متقی مرد اور عورتیں شامل تھے۔لیکن ان میں سب سے زیادہ پرہیز گار اور صفات سے متصف عالم وفاضل امام ابوشجاع ظاہر ابن رستم تھے۔ میرے اس آقا پر خدا کی رحمتیں نازل ہوں۔اس کی ایک کنواری دختر تھی' نازک اندام اور دلربا۔ جو اس کی طرف دیکھتا وہ اس کا دل موہ لیتی۔محفل میں اس کی موجودگی بولنے والوں اور سننے والوں کو وجد میں لے آتی۔ اس کا نام نظام تھا۔'' ابن عربی کو نظام کی ذہانت نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ ''وہ عالمہ تھی' مذہبی علوم میں طاق' اس کی آنکھیں جادو کرتی تھیں اور اس کے اندر عراقی حس ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔'' اس کے علاوہ نظام بلا کی خوش گفتار اور جادو بیاں تھی۔ ''وہ جب اپنا مافی الضمیر بیان کرنا چاہتی تو سننے

والے پراس کی بات واضح ہوجاتی اور جب وہ اختصار
اختیار کرتی تو اس میں بھی کمال کرتی۔''(20) نظام کے باپ کے گھر میں جو علمی اور دانشورانہ مجلسیں ہوتیں ان میں نظام ہر شخص کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔

ابن عربی کے اس قصے میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ابن عربی نے فیصلہ کیا کہ وہ نظام کے لیے اپنے شہوانی جذبات کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کی بجائے کھل کر بیان کرے گا۔اس کا سبب یہ تھا کہ اس کے خیال میں خدا سے عشق جن کیفیات کو پیدا کرتا ہے اور ایک عورت کی خوش گفتاری ایک مرد کے اندر جو شہوانی جذبات ابھارتی ہے ان دونوں کے درمیان بال برابر کا فرق ہے۔اس کی شاعری اس وقت بھی رسوائی اور چہ مگوئیوں کا سبب تھی اور آج بھی کچھ لوگوں کے
خیال میں وہ گناہ کی ایک دستاویز ہے۔ابن عربی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے جذباتی ہیجان کے بارے میں صفائی پیش کرے اور یہ بیان کرتا ہے کہ آسمانی عشق اور زمینی عشق کی سرحدیں بہ آسانی مٹ جاتی ہیں۔حلب' شام کے راسخ العقیدہ مذہبی حلقوں نے ابن عربی کے کلام کی سختی سے مذمت کی اور یہ کہا کہ ابن عربی کے اشعار جنسی جذبات کو ابھارنے والے اور ہوس پرستانہ ہیں اور ان کا روحانی وارداتوں سے کوئی تعلق نہیں۔اس کے بعد ابن عربی نے قلم اٹھایا اور ''ترجمان الاشواق'' ایسی باکمال اور بے مثال کتاب لکھی جس میں ہمیں عشق ایک چیستاں' ایک پہیلی اور کائناتی اسرار کے طور پر نظر آتا ہے۔اپنی اس کتاب میں وہ کوشش کرتا ہے کہ متشدد اور راسخ العقیدہ لوگوں پر خواہش کی نزاکتوں کو آشکار کر سکے جو اعلیٰ ارفع احساسات کو سمجھنے سے عاری تھے۔لیکن اپنی ہی بات کی نفی کرتے ہوئے ابن عربی کشش کی بہالے جانے والی فطرت کو تسلیم کرتا اور اس کا اعتراف کرتا ہے کہ تمام انسانوں کے اندر ''دوسرے'' تک پہنچنے اور حدود قیود کو عبور کرنے کی بے تابی ہوتی ہے۔خواہ یہ بے قراری صنف مخالف کے لیے ہو یا خدا سے مل جانے کے لیے۔شہوانیت کا یہ جشن جو متحرک توانائی کے طور پر تصوف میں اپنی پوری قوت سے نظر آتا ہے وہ مسلمان مصوروں کے یہاں بھی اس وقت آشکار ہوتا ہے جب وہ مہم جُو عورتوں

کو تیز رفتار گھوڑوں پر دریاؤں کو عبور کرتے دکھاتے ہیں۔

یہ تصویریں ان غیر متحرک عورتوں سے بالکل مختلف ہیں جو ہمیں مغربی حرم میں ملتی ہیں۔

پیرس چھوڑنے سے پہلے میری فرانسیسی ایڈیٹر کرسٹین نے مجھے اپنے پسندیدہ ریستوران میں دعوت دی۔ وہ فرانسیسی مردوں کے تخیلاتی حرم کے حوالے سے کچھ باتوں میں میری شراکت داری چاہتی تھی۔ اس نے مجھے پہلے سے خبردار کر دیا تھا کہ وہ مجھے جس ریستوران میں لے جارہی ہے وہ

"Le Restaurant du Louvre" تھا۔ جہاں کا ماحول نمودونمائش والا اور بورژوائی تھا۔ سیاحوں کا وہاں گرمجوشی سے استقبال نہیں ہوتا تھا۔ وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ اس کی کہی ہوئی بات درست تھی۔ میں نے جیسے ہی ریستوران میں قدم رکھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی ایسے اعلیٰ فرانسیسی گھر میں داخل ہورہی ہوں جس کے ادب وآداب سے مجھے آگاہی نہیں اور میں اس کی روایات کی بے حرمتی کا سبب بن سکتی ہوں کیونکہ میرا تعلق ایک دوسری ثقافت سے ہے۔ میرے چاندی کے کھنکتے ہوئے کنگن اور ہار اس جگہ کے لیے قطعاً موزوں نہ تھے، ستم بالائے ستم میری جیکٹ بھی ایک چھوٹے کفتان سے مشابہہ تھی اور جس پر رنگوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ لیکن جب کرسٹین نے اندر قدم رکھا تو لوگوں نے اسے مڑ کر دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اس کے لیے وہی ستائش تھی جو ان تمام فرانسیسی عورتوں کیلئے ہوتی ہے جو اس کی طرح اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔

کرسٹین بھی ہمیشہ سیاہ اور ہیجان انگیز لباس پہنتی ہے۔ اس روز وہ ایک تنگ یماموٹو ریشمی لباس پہنے ہوئے تھی اور اس کا ایک شانہ بالکل عریاں تھا۔ اس نے ریستوران میں موجود لوگوں کی طرف ایک ایسی نگاہ غلط انداز ڈالی جیسے وہ ابھی ابھی کسی زیادہ شائستہ اور تہذیب یافتہ سیارے سے یہاں پہنچی ہے۔ اس نے ایک نہایت پرتکلف اور سنہرے کام والے نرم صوفے پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے سرگوشی میں کہا ''یاد ہے نا میں نے تم سے اس ریستوران کے پُرتکلف اور تصنع

آمیز ماحول کے بارے میں کیا کہا تھا؟ یہ پیرس کی ان
نادر جگہوں میں سے ایک ہے جہاں ہماری اشرافیہ اس بات کی ہمت رکھتی ہے کہ وہ مجھ ایسے پرولتاریوں کے سامنے اپنے خاندانی زیورات کی نمائش کر سکے۔ ہم پرولتاریہ جنہیں آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے تا کہ ہم جمہوریہ کو ٹیکس ادا کر سکیں۔''

میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ میں ہمیشہ اس بات پر حیران ہوتی ہوں کہ فرانسیسی اپنی روزمرہ گفتگو میں کس قدر انقلابی ہیں۔ وہ ہمیشہ مراعات یافتہ طبقے اور پادریوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور جب ووٹ ڈالنے کا وقت آتا ہے تو ان ہی کو برسراقتدار رکھتے ہیں۔ ویٹر کو بلانے سے پہلے کرسٹین نے آئینہ اور لپ اسٹک نکالی اور اپنے میک اپ کو یوں ٹھیک کرنے لگی جیسے ہم وہاں بالکل تنہا ہوں' اس دوران وہ نہایت سکون سے ''اشرافیہ'' کا بھی مشاہدہ کرتی رہی۔

''کیا تمہیں یقین آئے گا کہ انقلاب کے دوصدیوں بعد بھی ہماری اشرافیہ ہمیشہ کی طرح ہٹ دھرم ہے۔'' اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے کئی لوگوں نے اس کا یہ جملہ سنا ہوگا۔ لیکن اسے اس کی ذرہ برابر پرواہ نہ تھی اس کی توجہ چھوٹے شیشے پر تھی پھر اس نے اپنی انگلیوں سے ہلکے بھورے رنگ کے اپنے تراشیدہ چھوٹے بالوں میں شانہ کیا اور انہیں پہلے سے زیادہ منتشر کر دیا۔

میں فرانسیسی عورتوں کی اس بات پر ستائش کرتی ہوں کہ وہ کیفے میں ویٹر سے اس بات پر جھگڑنے میں ذرا نہیں ہچکچاتیں کہ اس نے انہیں نظر انداز کیا ہے۔ جبکہ مراکش میں عوامی جگہوں پر میں اپنی توانائی کو برباد کرنے سے بچتی ہوں جہاں مردوں کا یہ عمومی رویہ ہے کہ وہ قطار میں آگے پہنچنے کے لیے عورتوں کو دھکے دیتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ میں اپنی فرانسیسی دوستوں کے کبھی ختم نہ ہونے والے انقلاب سے ہمیشہ بہت محظوظ ہوتی ہوں۔ لیکن اس وقت میں یہ چاہتی تھی کہ کرسٹین اپنی مقدس عوامی جنگ کو ختم کر کے ایک زیادہ اہم موضوع پر توجہ مرکوز کرے۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ کیا کانٹ کے یہاں حسن کا جو

فلسفیانہ تصور پایا جاتا ہے اس میں اور انگریس کی بنائی ہوئی غیر متحرک اور سرفگندہ حرم کی حسینہ کے درمیان کسی قسم کا تعلق ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا ''کسی کو مجھے یہ سمجھانے کا فرض ادا کرنا پڑے گا تا کہ میں اپنے ذہن کو قدرے آرام دے سکوں۔''

کرسٹین نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے مجھے یاد دلایا کہ مغرب میں مردوں نے صدیوں عورتوں کو فنون لطیفہ کے پیشوں میں داخل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ یہ فنون اسی طرح عورتوں پر ممنوع رہے جس طرح ان سے بہت پہلے یونانیوں نے اپنے غلاموں کو مصور کی ممانعت کر رکھی تھی۔ اس نے دینیات کی تاریخ کی امریکی پروفیسر مارگریٹ مائلز کا حوالہ دیا۔ جس نے کہا ہے کہ ''پیشہ ورانہ مصوری کے سماجی آداب مصور کے مرد ہونے پر اصرار کرتے تھے۔ وہ اکیڈمیاں جہاں انسانی بدن کے نقش بنانا اور برہنہ ماڈل کو دیکھ کر مصوری کرنا سکھایا جاتا تھا۔ وہاں اٹھارہویں صدی تک عورتوں کو داخلہ لینے کی اجازت نہیں تھی۔'' (21)۔ کرسٹین یہ جان کر حیران رہ گئی کہ میں آرٹ کے بارے میں لکھے جانے والے لٹریچر کی اس نئی شاخ سے بالکل واقف نہیں جو The Gaze کہلاتی ہے۔ اس نے دھڑا دھڑ ان کتابوں کے نام لینے شروع کر دیئے جو اس موضوع سے واقفیت کے لیے مجھے فوراً پڑھ لینی چاہئیں۔ میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ از راہ کرم مجھے پڑھنے کے لیے مزید کتابیں نہ دؤ اس بارے میں بس اہم باتیں بتا دو۔ مجھ میں پیرس سے کاسابلانکا جاتے ہوئے مزید فالتو سامان پر لگنے والے ٹیکس میں اضافہ برداشت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پہلے ہی میرے پاس سامان مقررہ حد سے کہیں زیادہ ہو چکا ہے۔۔ کرسٹین نے میری بات مانتے ہوئے کہا کہ اس کی تہذیب میں تفکر کی طرح مصوری بھی خالصتاً مردوں کا حق تھی۔ پھر اس نے شامپئن کی چسکی لی اور کہنے لگی۔'' جہاں تک لفظ "Gaze" ''تکنے'' کا تعلق ہے۔ تو اس کا معاملہ یوں ہے کہ مغربی مردوں نے جب حرم کی تصویریں بنائی ہیں تو اس میں خود کہیں موجود نہیں ہیں۔ یہ ان مسلمان مصوروں کے

برعکس بات ہے جو بینا طوری تصویروں میں اگر حرم کو مصور
کر رہے تھے تو اس میں خود بھی موجود تھے۔ انگریس کے حرم میں تم کسی ساتھی مرد کو نہیں دیکھو گی۔
کبھی کبھی کسی غلام کی جھلک نظر آ جاتی ہے لیکن ان میں آ قا موجود نہیں'

میں نے چونک کر اسے دیکھا وہ درست کہہ رہی تھی' یہ میری حماقت تھی کہ میں نے اس بات کو شعوری طور پر محسوس نہیں کیا تھا۔ ''مغربی مصوری میں شہوانیت ہمیشہ مرد دیکھنے والے کی نظر سے دیکھی گئی جس نے ایک بے لباس عورت کو ایک چوکھٹے میں منجمد کر دیا۔'' کرسٹین نے کہا کہ میری طرح وہ بھی اس بات کا حتمی طور سے یقین رکھتی ہے کہ فلسفے اور مصوری کے درمیان ایک منطقی ربط تھا۔ اور یہ رشتہ کانٹ اور انگریس کے درمیان بھی موجود ہے۔ ''اب بھی میں یہ جملہ سنتی ہوں کہ اپنی بکواس بند کرو اور خوبصورت نظر آتی رہو۔ یہ جملہ میں اپنے دفتر اور اپنی ذاتی زندگی دونوں میں سنتی ہوں۔ فاطمہ یہ بات یاد رکھنا کہ میں جب اسکول میں پڑھ رہی تھی اس وقت بھی مولیر کا ڈراما Les Femmes Savantes ہمارے نصاب میں شامل تھا۔ یہ وہ ڈراما ہے جس میں مولیر ان عورتوں کا مذاق اڑاتا ہے جو تعلیم حاصل کرنے کی آرزو رکھتی ہیں۔ اور میں تمہیں 1960ء کی بات بتا رہی ہوں جب میں اسکول میں تھی۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کرسٹین اس ڈرامے کے ایک مرد کردار کلی ٹانڈر کا وہ مکالمہ سنانے لگی جو اسے اب تک حفظ تھا اور جس میں یہ کردار پڑھی لکھی عورتوں کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''دانشور عورتیں مجھے ہضم نہیں ہوتیں۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ عورتوں کو ہر طرح کی باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ لیکن میں اس عورت کو برداشت نہیں کر سکتا جو اپنے اندر یہ ناپسندیدہ آرزو رکھتی ہے کہ وہ عالم فاضل ہونے کے لیے علم حاصل کرے۔ گفتگو میں جب اس نوعیت کے معاملات زیر بحث آتے ہیں تو میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ یہ بھی نہیں جانتی ہو کہ وہ کیا جانتی ہے''(22)

کرسٹین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ

17 ویں صدی جسے خرد افروزی کی صدی کہا جاتا ہے اور جب انسان دوستی اور عقل پرستی کا عروج ہو رہا تھا۔ وہ پوری صدی مولیر اور اس جیسے خیالات رکھنے والے دوسرے ادیبوں سے منسوب ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پڑھی لکھی عورتوں کی توہین کر کے اور ان کا مضحکہ اڑا کر بے پناہ کامیابی حاصل کی۔

کرسٹین کہنے لگی کہ ''مولیر نے اپنا ڈرامہ 'Les Femmes Savantes' 1672ء میں لکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے 1659ء میں Le Precieuses ridicules لکھا اور 1663ء میں اس کا ڈرامہ Ecole des femmes سامنے آیا۔ اپنے ان ڈراموں کے ذریعے وہ فرانسیسی دربار کو تعلیم یافتہ عورتوں پر قہقہے لگانے کا موقع فراہم کرتا تھا۔ وہ عورتیں جو سائنسی انکشافات کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہتی تھیں' ان ڈراموں میں انہیں بدصورت' کریہہ اور نفرت انگیز کردار کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔''

چند لمحوں بعد وہ کہنے لگی کہ ہمیں اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ جیکوئس جیسے مرد پائے جاتے ہیں جو ایسے حرم کے خواب دیکھتے ہیں جن میں تابعدار اور غیر متحرک کنیزیں بھری ہوئی ہوں لیکن جب وہ پیشہ ورانہ طور پر کسی ذہین عورت سے متاثر ہونے لگتے ہیں تو خوف سے ان کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔

کرسٹین نے جب جیکوئس کے بارے میں گفتگو شروع کی تو میں خاموش رہی۔ میں یقیناً یہ بات اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اسے اغواء کرنے اور پھر کسی ویران جزیرے میں لے جانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ جیکوئس کو جنم دن کے تحفے کے طور پر دینے کے لیے اس نے جون برگر کی کتاب Ways of Seeing خریدی ہے۔ میں نے اس سے التجا کی کہ وہ بتائے کہ اس کتاب کا خلاصہ کیا ہے اور اس کے توسط سے جیکوئس کو کیا سمجھانا چاہتی ہے۔؟ اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کرسٹین نے کہا کہ جون برگر نے اس کتاب میں پوری مغربی تاریخ کے

اندرعورتوں کی شبیہوں کے معاملے کوصرف ایک جملے میں
کشید کردیا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ ''مرد عمل کرتے ہیں اورعورتیں دکھائی دیتی ہیں'' اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کرسٹین نے برگر کا ایک اور جملہ سنایا کہ ''مرد عورتوں کو دیکھ سکتے ہیں اور عورتیں یہ دیکھتی ہیں کہ انہیں دیکھا جارہا ہے۔''(23) کرسٹین نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں یقیناً اس بارے میں حیران نہیں ہونا چاہیے کہ مغربی مردوں نے ''مشبیہہ'' کو وہ اہم ہتھیار بنالیا ہے جس سے وہ عورتوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

لیکن یہ پیرس میں کیسے ممکن ہے جہاں عورتوں نے ہر شعبے میں اپنی جگہ بنالی ہے اور جہاں وہ مردوں سے ہر وضع کی ملازمت میں مسابقت کرتی ہیں؟ میں نے کرسٹین سے سوال کیا۔

''یہ درست ہے کہ عورتوں کو ملازمتیں ملتی ہیں''۔کرسٹین نے کہا ''لیکن تم ہر جگہ مقتدر اور بااثر مردوں کو دیکھوگی جو اپنے گرد نوجوان عورتوں کو اکٹھا کیے رہتے ہیں تا کہ بڑی عمر کی اور زیادہ تجربہ رکھنے والی عورتیں جو اچھے عہدوں پر پہنچ گئی ہیں انہیں غیر مستحکم کرسکیں۔ایک فرانسیسی کمپنی کی شاندار اور شیشوں سے آراستہ عمارت شانز ایلیزے پر ہوسکتی ہے لیکن اس کے اندر کا ماحول اب بھی کسی حرم کی مانند دم گھونٹ دینے والا ہے۔مردوں کو اس وقت غیر محفوظ ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ عورتوں سے حسد میں مبتلا ہوجاتے ہیں جب اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے والی عورتیں مردوں جتنی آمدنی پر اصرار کرتی ہیں۔''

ہم ریستوران سے نکلنے ہی والے تھے جب مشرق کے حوالے سے کرسٹین کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔''مسلم مینا طوری مصوری میں عورتوں کے بارے میں تمہاری تحریر پڑھتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ جب کسی خلیفہ یا بادشاہ کے دربار سے وابستہ مصوروں کو یہ تصویریں بنانے کی اجازت مل جاتی تھی تو کیا اس طرح حرم کی عورتوں کو بھی اس بات پر کسی قدر اختیار نہیں مل جاتا تھا کہ کیا تصویر بنوائی جائے؟''

اس کا سوال سنتے ہی میرے ذہن میں مغل شہنشاہ جہانگیر کی بیگم نور جہاں کا خیال آیا۔

نور جہاں حرم کی چار دیواری میں رہتی تھی' اس کے باوجود
وہ صرف سیاست پر ہی نہیں فنون لطیفہ پر بھی اثر انداز ہوتی تھی۔ سولہویں صدی کے ہندوستان میں وہ مصوروں کو احکامات جاری کرتی تھی کہ وہ کس طور عورتوں کو مصور کریں۔ اس نے شاہی نگار خانے کے بعض بہترین مصوروں سے اپنی شبیہ بنوائی جس میں وہ رائفل سے مسلح ہے۔

میری یہ بات سن کر کرسٹین نے کہا ''اگر نور جہاں محض تمہارے ذہن کی اختراع نہیں ہے اور یہ ایک تاریخی شخصیت ہے جو اپنے زمانے میں واقعی موجود تھی تو ہوسکتا ہے کہ ہمیں اس بات کا کھوج مل جائے کہ مغربی عورتیں مصوری پر کیوں اثر انداز نہیں ہوسکیں۔''

میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے کرسٹین سے کہا کہ ''اپنی بات زیادہ وضاحت سے بیان کرو۔''

''حرم کی عورتوں میں سے نور جہاں جو بادشاہ بیگم تھی وہ مینا طوری تصویروں کو خرید سکتی تھی جبکہ مغرب میں تصویروں کے خریدار صرف مرد تھے۔'' کرسٹین نے جواباً کہا۔

کیا دلچسپ بات تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر آپ اپنے اسرار پر سے پردہ اٹھانے کے لیے غیر ملکیوں سے سوالات کریں تو ان کے جوابات آپ کو بہت کچھ دے جاتے ہیں۔

(12)

ملکہ نور جہاں چیتوں کا تعاقب کرتی ہے

نور جہاں پیدا ہوئی تو اس کا نام مہر النساء رکھا گیا لیکن 1611ء میں جہانگیر سے شادی کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا نام بدل دیا وہ چاہتی تھی کہ ہر شخص یہ جان لے کہ اس کا پسندیدہ مشغلہ چیتوں کا شکار ہے۔ اس نے متعدد چیتوں کو ہلاک کیا اور بہترین شکاریوں سے مسابقت کی۔ ''وہ جب ملکہ ہوئی تو جلد ہی ماہر ترین نشانہ باز کے طور پر مشہور ہوئی' یہاں تک کہ اس میں اس نے جہانگیر کے بہترین نشانچی مرزا رستم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔''(1)۔اس تناظر میں دیکھیے تو ہمیں یاد آتا ہے کہ انگریس کا محبوب مشغلہ وائلن بجانا تھا۔1818ء میں جے الاکس نے روم میں اس کی ایک پورٹریٹ پینٹ کی ہے۔ جب وہ 38 برس کا تھا۔ اس تصویر میں انگریس اپنے اسٹوڈیو میں وائلن بجارہا ہے جبکہ اس کی نئی بیوی میڈیلن اسٹوڈیو سے باہر کھڑی ہے اور اسے تحسین کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ جے الاکس کی اس پورٹریٹ کا کوئی ثانی مسلم میناطوری تصویروں میں ملنا مشکل ہوگا۔ مسلمان میناطوری مصور شاید ایسی تصویر بنائے جس میں عورت کوئی ساز بجارہی ہو (یا جنگلی جانور کا شکار کررہی ہو) جبکہ مرد اسے دیکھ رہا ہو۔لیکن نور جہاں کی نمایاں اور شاندار چال یہ نہیں تھی کہ وہ چیتے کا شکار کرتی تھی بلکہ اس کا وہ اثر ورسوخ تھا جو اس نے مصوروں پر قائم کیا۔

1617ء میں بنائی جانے والی ایک مینا طوری

تصویر واشنگٹن ڈی سی کی گیلری آف آرٹ (اسمتھ سونین انسٹیٹیوٹ) کی دیوار پر آویزاں ہے۔ جس کا عنوان ہے:۔ ''جہانگیر اور شہزادہ خرم' نور جہاں کی ضیافت میں۔'' یہ مینا طوری تصویر حیران کر دیتی ہے اور ایک انقلابی قدم ہے۔ یہ تصویر اسلامی مصوری کی تاریخ میں عمومی طور پر اور حرم کی عورتوں کی تصویر کشی میں خصوصی طور سے جس نمایاں تبدیلی کی خبر دیتی ہے اس کی کم سے کم تین وجوہ ہیں۔ پہلی یہ کہ مصور نے شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کی جو تصویریں بنائی ہیں وہ واقعی ان کی شبیہ ہیں۔ اس وقت تک زیادہ تر مسلم مینا طوری تصویروں میں جو زیادہ تر ایرانی مصوروں کی بنائی ہوئی تھیں وہ اساطیری کرداروں کو مصور کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ایران کے قومی رزم نامے ''شاہ نامہ'' کے بادشاہ یا خمسہ نظامی کی عشقیہ مثنوی کی ہیروئن شیریں یا عہد نامۂ قدیم سے سلیمان بادشاہ اور ملکہ سبا کے کردار۔ اس کے برعکس یہ مغل تھے جنہوں نے مینا طوری تصویروں میں مغربی انداز کی تصویر کشی کا آغاز کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ کے حقیقی خدوخال پیش کیے جائیں ''تاکہ اس وقت کے حکمران کی جائز حکومت''(2) کو مستحکم کیا جائے۔ مختصراً یہ بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ مغل پہلے مسلمان حکمران تھے جنہوں نے تصویری عکس کو سیاسی پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے نشاۃ ثانیہ کے عہد کے فرانسیسی یا برطانوی بادشاہ کیا کرتے تھے۔ کسی بھی مسلم دربار میں یہ بات اس سے پہلے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔(3)

جہانگیر' شہزادہ خرم اور نور جہاں کی یہ مینا طوری تصویر اس لیے بھی انقلابی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں مصور نے شہنشاہ کو تنہا نہیں دکھایا ہے بلکہ وہ اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان ملکہ جسے پردہ نشین اور حرم کی خلوت میں سب سے الگ تھلک ہونا چاہیے تھا وہ بے نقاب دکھائی گئی ہے۔ آپ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آج بھی سعودی عرب کے بادشاہ کی طرح کئی مسلمان سربراہان مملکت ایسے ہیں جو اپنی بیگمات کو خلوت نشین رکھتے ہیں اور ان کی بیگمات سرکاری تقریبات میں شاذونادر نظر آتی ہیں۔ اس تناظر میں دیکھیے تو

اندازہ ہوگا کہ نور جہاں کس قدر انقلابی اور باغی مزاج رکھتی تھی۔

اس مینا طوری تصویر کو اسلامی مصوری میں ایک انقلابی قدم کہنے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں ملکہ کو میزبان کے طور پر دکھایا گیا ہے''جہانگیر یقیناً اس تصویر میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن دیکھنے والوں کی توجہ میں اب نور جہاں بھی شراکت دار ہے۔ وہ نہ صرف ضیافت کا اہتمام کرتی دکھائی دے رہی ہے بلکہ بہت سی کنیزیں بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔''(4)۔غرض' صرف یہی نہیں ہے کہ ملکہ کو اس تصویر میں سبقت حاصل ہے بلکہ اس نے دربار کے مصوروں کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں تاکہ وہ اس کی دی ہوئی ضیافت کے جشن کو مصور کریں۔نور جہاں نے یہ جشن 1617ء کو شہزادہ خرم کے اعزاز میں منایا جب وہ دکن کی ریاست کو فتح کر کے لوٹا تھا۔ یاد رہے کہ شہزادہ خرم اس کا سوتیلا بیٹا تھا۔ یہ جشن واضح طور پر سیاسی تھا اور اس میں کئی غیر ملکی سفیر مدعو کیے گئے تھے۔ جن میں انگلستان کا سر تھامس رو بھی شامل تھا۔(5) اور ہاں اس مینا طوری تصویر میں جزیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے''شراب کے پیالے' کپڑے کی حسین بنت اور جواہرات کی جگمگاہٹ' گہرے گریبان اور کھلی ہوئی کمر۔'' یہ جزیات اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ حرم کی عورتوں کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی آ رہی تھی اور اب وہ پہلے کی طرح اتنی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھیں اور یہ صرف ایک عورت کی پیش قدمی کا کمال تھا۔

اسلام میں زن بیزاری کا معاملہ سچ تو یہ ہے کہ خاصا کمزور ہے اور اس کا انحصار اس پر ہے کہ اگر عورتیں برسر عام آ جائیں تو مردوں کی حاکمیت سنگین طور پر خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید مسلمان مرد عوامی معاملات پر اپنی اجارہ داری بڑی حد تک کھو چکے ہیں اور اس کا سبب عورتوں کی بڑی تعداد کا سائنسی شعبوں اور مختلف پیشوں سے وابستہ ہو جانا ہے۔(6) محمد پنجم یونیورسٹی میں میرے محترم اسلام پسند ساتھی پروفیسر بن کیکی نے ایک روز یونیسکو کے مرتب کردہ اعداد و شمار اس وقت میرے سامنے رکھ دیے جب میں نے اسٹاف روم میں ابھی قدم

ہی رکھا تھا۔''اگر اسلام پسند سیاستدان اب بھی پارلیمنٹ میں عورتوں کے قدم رکھنے کے خلاف ہیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''بن کیکی نے یونیسکو کے جاری کردہ اعداد وشمار میرے سامنے لہراتے ہوئے کہا ''عورتوں نے اپنا خاموش انتقام لے لیا ہے اور وہ سائنسی شعبوں اور ٹیکنیکل پیشوں میں غول درغول آ گئی ہیں آج مصر میں سائنسی اور ٹیکنیکل شعبوں میں 28.7 فیصد' ترکی میں 29.3%' الجزائر میں 27.6% اور مراکش میں 31.3% عورتیں کام کررہی ہیں۔''(7)۔ وہ جب بول رہا تھا تو میں نے سوچا کہ ایک قدامت پسند مسلمان جس طرح عورتوں کی صورتحال کا تجزیہ کررہا ہے اس پر مجھے اعتبار کرنا چاہیے۔ تیل سے مالا مال مسلم ریاستوں کی عورتیں سائنسی میدانوں میں کام کرنے کے لیے کہیں زیادہ بے تاب ہیں۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں حجاب پہننے والی عورتیں تمام سائنس دانوں اور ٹیکنیشئنوں کا ایک تہائی ہیں (32.6%)۔ تیل کی افراط کے مزے لوٹتے ہوئے کویتی شیخ عورتوں کو ووٹ ڈالنے کا حق نہیں دیتے لیکن ملک کے سائنسی عہدوں کا 36% فیصد عورتوں کے پاس ہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا کی عورتیں سائنسی شعبوں میں سب سے آگے ہیں اور بالترتیب 40% اور 44.5% عہدوں پر فائز ہیں۔

ہم جب اسلام کی اس طویل روایت کو نظر میں رکھتے ہیں جس میں نور جہاں جیسی خودمختار اور مستحکم قوت ارادی رکھنے والی عورتیں گذری ہیں تب ہی جدید عہد میں مسلمان عورتوں کا سائنسی اور دیگر پیشوں میں اتنا زیادہ ابھار ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ایسی شاندار قوت ارادی رکھنے والی عورتوں کی مثال اور نظیر کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہوسکا ہے کہ ایران میں امام خمینی کے عورتوں کو حجاب پہننے پر مجبور کرنے کے فیصلے نے ایرانی عورت کے سیاسی شعور کو صیقل کیا اور انہیں زیادہ ''جرأتمند'' بنادیا ہے۔ ایک ایرانی دانشور ہالہ اسفند یاری نے اس صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نوجوان عورتیں اسلامی لباس کے حوالے سے اپنے اوپر عائد کردہ پابندیوں کو مانتے ہوئے ان کی خلاف ورزی بھی کرتی ہیں۔ زلف کی ایک لٹ جو'' کاکل''

کہلاتی ہے ان کے اسکارف سے جھانکتی ہے۔ اخلاقی
محتسبین کی موجودگی کے باوجود لپ اسٹک اور نیل پالش کا استعمال، جوق در جوق باہر نکل کر انہوں نے سماج میں اپنی حیثیت کو پھر سے حاصل کرلیا ہے۔'' (8)۔ اسفند یاری کی کتاب درجنوں ایرانی عورتوں سے گفتگو پر مشتمل ہے جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ اسلامی انقلاب ان کی زندگیوں پر کس طرح اثر انداز ہوا۔ وہ انٹرویو جو ہالہ اسفند یاری نے کیے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کو حجاب پہننے پر مجبور کرنا کسی بھی پُرعزم عورت کیلئے بغاوت پر اکسانے کی شدید ترغیب ہے۔ اب ہم پھر نور جہاں کی طرف پلٹتے ہیں اس نے حرم میں بیٹھ کر اپنے انقلاب کو کس طرح برپا کیا۔؟

نور جہاں اپنے آپ کو ہجوم کے سامنے کس طرح پیش کرتی تھی؟ کیا اس نے نظر آنے کے حوالے سے کوئی حکمت عملی طے کی تھی؟۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس بارے میں اس کی ایک حکمت عملی تھی۔ یہ ریشم و کمخواب میں لپٹی ہوئی اور زیورات اور جواہرات میں ڈوبی ہوئی ایک شمشیر زن عورت کی شبیہ تھی۔ جہانگیر سے شادی کے ایک برس بعد 1612ء میں ہندوستان کے سب سے بڑے مصور ابوالحسن نے ایک قلمی شبیہ بنائی جس کا عنوان تھا ''ایک خاتون رائفل کے ساتھ''، بہت سے محققین کا کہنا ہے کہ یہ تصویر ''ہمیں اس کی شکل وصورت کے بارے میں بتاتی ہے اس کے چہرے کا فطری حسن، کردار کی استقامت جو پورٹریٹ بنانے والوں کو بہت بھاتی ہے کسی گوشۂ تنہائی کی بجائے کھلی ہوا اور فضا کا حسن، بادشاہ کے پسندیدہ اور اپنے وقت کے سب سے نامور مصور ابوالحسن کے دستخط یہ بتاتے ہیں کہ مغل ملکہ نور جہاں کی یہ ہمارے پاس سب سے مستند شبیہ ہے۔(9)۔ یہ ابوالحسن ہی ہوسکتا تھا جسے اجازت ملتی کہ وہ اس کے حضور حاضر ہو اور اس کی شبیہ بنائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ مغل ہندوستان میں کیا نور جہاں واحد عورت تھی جو شکار سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ یا شکار کھیلنا عورتوں کا ایک عام مشغلہ تھا؟

بنیادی طور پر مغل سخت کوش خانہ بدوش تھے۔ وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والے ترکستانی منگول اپنا رشتہ چنگیز خان سے جوڑتے تھے، وہ فطرت کے پجاری تھے۔ اپنے محلوں میں وہ جو باغات لگاتے ان میں جنگلوں اور کھلی فضاؤں کی جھلک دکھانے کی کوشش کرتے۔ ان کے یہاں کھلے میدانوں میں کھیل کھیلنے کی روایت تھی جس میں مرد اور عورتیں دونوں حصہ لیتے۔ ''ان کی عورتیں دہائیوں سے تیراندازی کرتی چلی آئی تھیں۔ وہ پولو کھیلتیں اور ابتدائی مغل حرم کی تفصیل ہمیں بتاتی ہے کہ مسلح عورتیں زنانہ کی حفاظت پر مامور ہوتیں۔''(10)۔ ''زنانہ'' ترکوں کے حرم کا ہندوانہ نام ہے۔(11)۔

مسلمان ترکوں اور وسطی ایشیا کے منگولوں میں تقریبات اور جشن کے دوران عورتوں کی شاندار شمولیت نے عرب سیاحوں کو ہمیشہ حیران پریشان کیا۔ وہ اس مظہر کا جس قدر حیرت سے اظہار کرتے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ وہ قدامت پرست مسلمان تھے جو عورتوں کو حجاب اور گوشۂ تنہائی میں رکھنے پر سب سے زیادہ اصرار کرتے تھے۔ مارکوپولو کی طرح کا مسلمان سیاح ابن بطوطہ جو مراکش سے تعلق رکھتا تھا وہ 1334ء میں چین جاتے ہوئے وسط ایشیا سے گذرا اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ترک اپنی عورتوں کا کس اعلیٰ پیمانے پر احترام کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''میں نے ان علاقوں میں ایک خاص اور قابل ذکر بات یہ دیکھی کہ ترک اپنی عورتوں کی بے حد تعظیم کرتے ہیں۔ ترکوں میں عورتوں کو مردوں سے زیادہ اہمیت اور مقام حاصل ہے۔'' (12)۔ ایک اچھے مراکشی کے طور پر ابن بطوطہ اس وقت حیران رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ ایک شہزادہ، ایک عورت کو سلام کر رہا ہے۔ ''میں نے جب پہلی مرتبہ شہزادی کو دیکھا تو وہ ایک سجے سجائے رتھ میں سوار تھی جس پر نیلگوں رنگ کے نہایت پُرتکلف اور قیمتی پردے پڑے ہوئے تھے اس کے رتھ کے ساتھ ساتھ کئی رتھ دوڑ رہے تھے جن میں اس کی خدمت پر مامور عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ جب شہزادے کی قیام گاہ کے سامنے پہنچی تو وہ اپنے رتھ سے باہر آئی اور اس کے ساتھ ہی 30 عورتیں بھی ساتھ کے رتھوں سے اتر آئیں...... وہ شاہانہ انداز سے چلتی ہوئی

شہزادے کی طرف بڑھی......شہزادہ کھڑا ہوگیا اور اس کی
طرف بڑھا' اسے سلام کیا اور اسے دعوت دی کہ وہ اس کے برابر کی نشست پر فروکش ہو۔''
(13)۔ابن بطوطہ نے 750 صفحات کے اپنے سفرنامے میں جو اس نے 1355ء میں قلم بند
کیا۔ یہ بات بار بار لکھی ہے کہ ''ترک عورتیں نقاب نہیں پہنتیں۔'' اور کئی مرتبہ یہ بھی ہوسکتا ہے
کہ تم اس کے شوہر کو اس کا خادم سمجھ لو۔(14)۔ یہ تمام جملے آج کی اس سوچ کو مسترد کرتے ہیں
کہ اسلام صد فیصد زن بیزار ہے۔ابن بطوطہ کے یہ جملے اس بات کا ثبوت ہیں کہ گزرے ہوئے
زمانے سے آج تک مسلم کلچر کبھی بھی یکساں نہیں رہا۔اگر عرب اپنی عورتوں کو پردہ کراتے تھے اور
انہیں سماج کے حاشیوں پر رکھتے تھے تو ترک اور منگول ایسا نہیں کرتے تھے۔

یہ بات سولہویں صدی میں عورتوں کی مغل مینا طوری تصویروں کو سمجھنے میں مدد دینے
کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ نور جہاں نے اپنے لیے ایک نمایاں اور ممتاز مقام کس
طرح بنایا ہوگا۔

نور جہاں کا ایک سرمایہ اس کی عمر تھی۔اس نے 1611ء میں جب جہانگیر سے شادی کی تو
وہ ایک شرماتی' لجاتی ہوئی نوخیز اور نا کتخدا حسینہ نہیں تھی۔ وہ 34 برس کی بیوہ تھی اس کا شوہر
اشرافیہ سے تعلق رکھتا تھا اور بنگال کا منصب دار تھا جس کی موت پراسرار حالات میں ہوئی تھی۔
اس کی ہلاکت مشکوک تھی کیونکہ یہ بات زباں زد خاص و عام تھی کہ نوعمری سے جہانگیر نور جہاں
کے عشق میں گرفتار تھا۔''اپنے منفعل شوہر کی نا قابل توجیہ ہلاکت کے بعد نور جہاں شاہی دربار
کے قلب میں لوٹ آئی اور چند مہینوں بعد اس نے جہانگیر سے شادی کرلی۔''(15)۔ایک اہم
اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ نور جہاں ہندوستان میں غیر ملکی تھی اس کا تعلق ایران سے تھا اور وہ
شیعہ تھی(16)۔ جہانگیر بیشتر مغل حکمرانوں کی طرح راسخ العقیدہ سنی شاہی خانوادے سے تعلق
رکھتا تھا۔اس سے شادی کرنے کا مقصد بارودی سرنگوں سے بھری ہوئی جگہ پر قدم رکھنا تھا۔لیکن
نور جہاں ذہین تھی۔اس نے دربار میں اپنے خاندان کے مردوں کو اعلیٰ عہدوں پر پہنچا کر اپنا

حمایتی شیعہ گروپ

بنالیا۔''اس نے اپنے اردگرد اپنے قبیلے کا ایک حلقہ قائم کرلیا جس میں دوسروں کے ساتھ ساتھ اس کا باپ اعتماد الدولہ، جہانگیر کے وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔ وہ ایک ایرانی مہم جو تھا اور نور جہاں کا بھائی آصف خان بھی اعلیٰ عہدیدار ہوا۔''(17)

نور جہاں اگر صرف کھیلوں میں دلچسپی لینے والی عورت ہوتی یا ایک ایسی چالاک بیگم ہوتی جس نے اپنے اردگرد اپنے قبیلے کے مردوں کو اکٹھا کرلیا ہوتا تو وہ عمومی طور سے کبھی بھی اسلامی تہذیب کے منظرنامے پر اپنے غیرمعمولی اثرات ثبت نہیں کرسکتی تھی اور نہ فنون لطیفہ پر اس کی شخصیت کے خصوصی اور نمایاں اثرات مرتب ہوتے۔ وہ تعلقات عامہ کے شعبے میں دو سطحوں پر خصوصی مہارت رکھتی تھی۔ پہلی تو یہ کہ اس نے مصوروں کے نگارخانوں میں بذات خود قدم رکھا اور ان سے مصوری کے نئے انداز پر تبادلۂ خیال کیا۔ ان سے یہ کہا کہ وہ عورت، عشق اور ازدواجی قربت کو اپنی مصوری میں نئے رنگ میں پیش کریں۔ اور اس کے لیے ایسی محفلیں اور تقریبات اس کے اشارے پر منعقد ہوتیں جن میں وہ اپنے شاہی شوہر کے شانہ بشانہ ہوتی۔ دوسری یہ کہ وہ مصوری کے نمونوں کو جمع کرنے لگی۔ اس طرح بلاواسطہ طور پر وہ فیشن اور خوش ذوقی کے معاملات پر اثرانداز ہونے لگی۔'' ہم یہ بات جانتے ہیں کہ مغل اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی بیگمات تجارت کرتی تھیں...... ان کی اپنی تجارتی کشتیاں تھیں۔ جو ان کی پسندیدہ اشیائے تجارت لاتی اور لے جاتی تھیں اور ان بیگمات میں سے دو نمایاں ترین جہانگیر کی والدہ مریم زمانی اور نور جہاں تھیں۔''(18) ایک فعال تجارتی شخصیت کے طور پر نور جہاں کی شہرت غیرملکی سفارتی حلقوں کے درمیان اس قدر پھیلی ہوئی تھی کہ 1617ء اور 1618ء کے درمیان وہ برطانوی سفارت کی ''سرپرست'' کے طور پر نامزد کی گئی۔''(19)

نور جہاں اسلامی اور مغربی مصوروں دونوں سے آگہی رکھتی تھی۔ اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کا شوہر جہانگیر جو نصف ہندوستانی تھا ایرانی مینا طوری طرز مصوری سے وفادار نہیں

تھا۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ جہانگیر
مصوری کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور اپنے بچپن کے ہندو پس منظر سے ''درشن'' کی روایت کومستعار لے کر خود کو ایک ہندو دیوتا کے طور پر پیش کر رہا ہے۔''(20)

درشن کا لغوی مفہوم ''دیکھنا'' یا ''نظارہ کرنا'' ہے۔ ہندو مذہبی روایات میں ان کے دیوتا کبھی کبھی اپنے پوجا کرنے والوں کو درشن دیتے ہیں۔یعنی ان پر ظاہر ہوتے ہیں۔اوران کی عبادت کرنے والے ان کا ''نظارہ'' کرتے ہیں۔ ہندوستانی مصوری کے ایک ماہر مائیکل برانڈ کا کہنا ہے کہ ''جس طرح ہندو دیوتا درشن دیتے تھے۔اسی طرح مغل بادشاہ روزانہ اپنی رعایا کو درشن جھروکے سے اپنا ''درشن'' دیتے اوراس کے بعد یہی ''درشن'' درباریوں کو ''دربار عام'' میں دیا جاتا۔''(21)۔

ہندو روایت کے مطابق اگر کسی انسان کو دیوتا کے درشن ہوجائیں تو دیوتا کی کچھ طاقتیں دیکھنے والے کے اندر سرایت کر جاتی ہیں۔(22)۔ ہندوؤں کے ''درشن'' کی روایت کو اختیار کر کے مغل بادشاہوں نے اصل میں اسلام کی ایک اہم ترین پابندی کو توڑا جو کہ شخصیت پرستی کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ ایک مسلمان حکمران کی بنیادی خصوصیت منسکرالمزاجی اور فروتنی ہے۔ مثال کے طور پر گیارہویں صدی کے مصر میں ایک حکمران الحکیم نے خدا ہونے کا دعویٰ کر دیا تو قاہرہ کی آبادی نے فوری طور پر اس کے بارے میں فیصلہ سنا دیا کہ وہ ایک پاگل آدمی ہے۔اور اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔(23)۔ چنانچہ ہندو اثرات کے تناظر میں ہم نئی مغل مینا طوری تصویروں کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں جن میں شہنشاہ اور نور جہاں کے خدوخال کو ان کی صورتوں کے عین مطابق بنایا گیا تھا۔

نور جہاں کو سترہویں صدی میں چھوڑنے سے پہلے میں خود کو یہ سوال کرنے سے روک نہیں سکی کہ کیا مسلم تاریخ نے اس ناقابل یقین حد تک باغی ملکہ کو یاد رکھا؟ اس سوال کے جواب میں مجھے رباط کی محمد پنجم یونیورسٹی لائبریری میں گھنٹوں یا دنوں سر کھپانا پڑتا۔لیکن ایک عرب عورت

کو مردوں پر کم سے کم ایک فوقیت اور امتیاز حاصل ہے۔

اگر وہ کسی اسلامی ماہر کو فون کرے اور تاریخ یا شریعت کے بارے میں کوئی سوال کرے تو روایت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ مرد اس کو مطلوبہ معلومات فراہم کرے۔شریعت کا وہ ماہر جس سے میں اکثر رابطہ کرتی ہوں، وہ عموماً مجھے اپنی کتابوں کے متعلقہ صفحے دکھا دیتا ہے اور اکثر عاریتاً مجھے وہ کتابیں چند دنوں کے لیے دے بھی دیتا ہے۔تا کہ میں متعلقہ حوالے نقل کرسکوں۔ چنانچہ میں نے چند فون کیے اور چند دنوں کے اندر مجھے بتایا گیا کہ عمر قحالہ نے نورجہاں کے بارے میں کیا لکھا ہے

۔

یہ زیادہ پرانی نہیں 1955ء کی بات ہے جب ایک ترک نژاد مصری عالم عمر قحالہ نے مسلمان عورتوں کو ایک شاندار ترین تحفہ دیا۔ یہ پانچ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ہے جس میں سینکڑوں ''عرب اور مسلم دنیا کی نامور خواتین'' کے حالات زندگی جمع کیے گئے ہیں اور اس فہرست میں یقینی طور سے نورجہاں بھی شامل ہے۔عمر نے اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس کے بادشاہ شوہر کا تذکرہ برائے نام ہے۔اس کی زندگی کے سامنے شہرزاد کی کہانیوں کی شہزادیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔عمر قحالہ نے لکھا کہ'' وہ ہندوستان کی حسین اور باوقار ملکہ تھی۔ وہ فارسی اور عربی جانتی تھی اور دونوں تہذیبوں سے بہ خوبی آشنا تھی۔ وہ فن موسیقی اور دوسرے شائستہ فنون میں طاق تھی۔ اس نے اپنی سلطنت کے معاملات بہت زیرکی سے چلائے۔اس نے ٹیکس عائد کیے اور روزمرہ ملکی معاملات کا باریک بینی سے جائزہ لیتی۔وہ محل کے ایک دریچے سے مملکت کی اشرافیہ اور رعایا کو اپنا درشن دیتی اور فوجوں کا معائنہ کرتی۔اس کے نام کا سکہ ضرب ہوا جس میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ نظر آتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ وہ محل کی دوسری عورتوں کے ساتھ شکار کھیلنے جاتی اور یہ عورتیں مردوں کی طرح تیز رفتار ترین گھوڑوں پر سواری کرتیں''(24)

سرفگندہ کنیزیں جنہیں انگریس اور اس کے جدید وارثوں مثلاً ماتیس نے مصور کیا۔ وہ مشرق میں اپنا وجود نہیں رکھتیں اور ایرانی مینا طوری تصویریں ماتیس کیلئے کوئی سریت نہیں رکھتی

تھیں جس نے 1910ء میں اسلامی آرٹ کی ایک نمائش
کا دورہ کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا ''ایرانی مینا طوری تصویروں نے میری حسیات کے تمام امکانات مجھ پر آشکار کر دیے۔'' (25) ماتیس کو کمال اتاترک کے مثالی حسن سے کوئی دلچسپی کیوں نہیں تھی؟ اسے ان عورتوں میں حسن کیوں نظر نہیں آ رہا تھا جو پردہ ترک کر چکی تھیں اور جہاز اڑا رہی تھیں؟ یہ بات عجیب سی محسوس ہوتی ہے کہ 1920ء کی دہائی میں مشرق کا ایک فوجی کمال اتاترک آزاد عورتوں کے خواب دیکھ رہا تھا اور جمہوریت میں پرورش پانے والا ماتیس کنیزوں کے خواب دیکھ رہا تھا اور ایک ایسی اسلامی تہذیب کے خواب جسے وہ عورتوں کی غیر فعالیت سے گڈمڈ کر رہا تھا۔

مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے مردوں کی سائیکی میں تصور حسن کے پس پشت کیا اسرار و رموز پوشیدہ ہوتے ہیں؟ میں اپنی کتاب کی تشہیری مہم سے واپس آئی تو اپنے ساتھ پڑھانے والے مرد ساتھیوں سے یہی سوال کرتی رہی یہاں تک کہ میرے پسندیدہ بنیاد پرست ساتھی پروفیسر بن کیکی نے اپنے اس جملے سے مجھے خاموش کر دیا کہ:

''فاطمہ! یہ بات تمہارے ذہن پر کسی کابوس کی طرح کیوں سوار ہے کہ اس بارے میں مرد کیا سوچتے ہیں؟ تمہاری عمر کی ایک اچھی مسلمان عورت کو مردوں پر سے توجہ ہٹا کر ان ناخواندہ عورتوں کی طرف مبذول کرنی چاہیے جنہیں تم جیسی مراعات یافتہ عورتوں کی ضرورت ہے۔ تم مردوں کے بارے میں بھول کر عبادت پر دھیان دو تا کہ خدا تمہارے گناہ معاف کر سکے۔''

اپنے قدامت پرست ساتھی کے اس نہایت اشتعال انگیز جملے نے مجھے چونکا دیا اور میں سمجھ گئی کہ میرے ذہن میں اٹھنے والا سوال اہم تھا۔ میں نے خود سے کہا کہ ''اگر تمہارا کوئی خیال کسی رجعت پرست مرد کو ناگوار گزرتا ہے تو اس خیال اور اس سوال کو ترک مت کرو کیونکہ وہ شاید تمہیں کئی اہم باتوں سے آشنا کرے گا۔'' یہی سوچ کر میں نے پروفیسر بن کیکی پر مردوں کے خواب و خیال کے حوالے سے سوالات کی بوچھاڑ بند کر دی اور اسی بات پر صبر کر لیا کہ شاید اس

چیتاں کے ساتھ مجھے کئی مہینے گذارنے ہوں گے۔

اگلی گرمیاں آئیں تو میں رباط اور کاسابلانکا کے درمیانی ساحل تمارا پر چلی گئی جو کہ بحر اوقیانوس کے کنارے واقع ہے۔ اور وہاں جا کر میں نے انگریس اور ماتیس اور ان کے حرم کو بھولنے کی کوشش کی۔ ان کے بارے میں سوچنے کے بجائے میں صبح دم سمندر کی غراہٹیں سنتی اور غروب آفتاب کے حسین مناظر دیکھتی اور شب ماہتاب گھنٹوں سمندر کی بلند لہروں کے ساتھ تیرتی رہتی۔ اس دوران میں نے عورتوں کے حوالے سے مردوں کی خیالی دنیا کے بارے میں بھلانے کی بھرپور کوشش کی تا کہ میں ایک مثالی مسلمان عورت کے بارے میں پروفیسر بن کیکی کے تصورات اور معیارات کی پیروی کرسکوں۔ میں نے دعائیں کیں اور گیان دھیان بھی کیا لیکن یہ سب کچھ سمندر میں کھڑے ہوکر کیا۔ ان جزئیات کا بیان بظاہر معمولی لیکن بہت ضروری ہے جن کا مفہوم شاید میرے عزیز ساتھی کے سر پر سے گزر جائے اور وہ یہ کہ دور جدید کی مسلمان عورت کی رسائی سمندر تک ہوگئی ہے۔ ان عورتوں نے حرم کی حد بندیوں کو منہدم کر دیا ہے اور باہر کی دنیا میں پھیل گئی ہیں۔ ہم عورتیں حجاب میں ہوں یا بے نقاب، ہم کروڑوں کی تعداد میں سڑکوں پر نظر آتی ہیں حرم کی چار دیواری میں عبادت کرنا ایک بات ہے اور بحر اوقیانوس کی لہروں میں کھڑے ہوکر دعا مانگنا ایک بالکل الگ بات۔ میں سمندر میں ہوتی ہوں تو خود کو کائنات سے جڑا ہو محسوس کرتی ہوں۔ میں اتنی ہی طاقتور اور بااثر ہوجاتی ہوں جتنی شہرزاد کی وہ عورت جس کا لباس پروں کا تھا۔ سرکاری خرچ پر تعلیم حاصل کرکے، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک رسائی حاصل کرکے مسلمان عورتوں نے طاقت پرواز حاصل کرلی ہے۔

کمال میرے اس نقطہ نظر سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہے کہ مسلم معاشروں کی مرد اشرافیہ عورتوں کے خلاف اپنی جنگ پہلے ہی ہار چکی ہے۔ افغانستان اور الجیریا میں عورتوں پر بدترین تشدد کے واقعات مسلم مطلق العنانی اور زن بیزاری کے عہد کے خاتمے کا اشارہ ہیں۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ "ہمارے خطے میں عورتیں ایک عظیم الشان طاقت بن کر ابھری ہیں۔ وہ جمہوری حقوق

کے لیے اور ناانصافی کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں۔

عیسائی مغرب کے برعکس، مسلمان مرد عورتوں کو اپنے برابر اور مساوی سمجھتے ہیں وہ انہیں ذہن، توانائی اور بغاوت کی صلاحیت بخشتے ہیں تا کہ وہ سلسلۂ مراتب کو دعوت مبارزت دے سکیں۔ فاطمہ تم اور تمہارے ساتھ کی عورتیں فتح مند ہیں۔''

کمال جب میرے ساتھ اتنی شائستگی سے پیش آئے اور میرے تصورات کی حمایت کرنے لگے تو میں یہ سوچنا شروع کر دیتی ہوں کہ کہیں وہ میری پکائی ہوئی خوش ذائقہ Tagine مچھلی کھانے کے لیے تو یہ سب کچھ نہیں کر رہا۔ اس مچھلی کو تیار کرنے میں میرا بہت زیادہ وقت اور روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ اس شہوت انگیز مچھلی کی تلاش ہوتی ہے جو ''قرب'' کہلاتی ہے اور جس کا مطلب ''قریب آنا'' ہے۔ ایک طالبہ کے طور پر جب میں پہلی مرتبہ رباط پہنچی اس وقت سے میں اس مچھلی کے کمالات کی کہانیاں سن رہی ہوں۔ اپنے آبائی شہر فیض میں جو سمندر سے 300 کلومیٹر دور ہے، ہم نے کبھی اس جادواثر مچھلی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ لیکن یہاں رباط میں آپ کو یہ آسانی سے نہیں ملے گی کیونکہ ہر شخص اسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ لوگ ساحل پر لگنے والے مچھلی بازار میں آپ کو ''قرب'' کی تلاش میں نظر آئیں گے اور یہ تلاش کاسابلانکا تک ہوتی ہے۔ اس خزانے کی تلاش میں آپ کو پانچ بجے منہ اندھیرے نکلنا پڑتا ہے لیکن ہم رباطیوں کی یہ خوش بختی ہے کہ ہمیں کاسابلانکا میں رہنے والے تیس لاکھ شہریوں سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا۔ کاسابلانکا والے امریکیوں کی طرح ہیں۔ وہ اپنی توجہ شہوانیت کی بجائے پیسے پر مرکوز رکھتے ہیں۔

میں تاہم اتنے برسوں میں ''قرب'' کے بارے میں اتنا زیادہ جان گئی ہوں کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اس میں کون کون سے مصالحہ جات کتنی مقدار میں ملائے جائیں کہ وہ آسمان سے اتری ہوئی نعمت محسوس ہو۔ اس حوالے سے میری شہرت ساری یونیورسٹی میں ہے اور اس نے میری پیشہ وارانہ ترقی میں بھی کردار ادا کیا ہے۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھانے والی

خواتین اور حضرات ''قرب'' کے چند نوالوں کے عوض

مجھے ہر نوعیت کی معلومات مہیا کرنے کے لیے خوشی خوشی تیار رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ میں ''قرب'' پکانے کے نسخے کی ایک راز کی طرح حفاظت کرتی ہوں۔ ویسے میں آپ کو یہ نسخہ بتا سکتی ہوں۔ بہت سا تازہ دھنیا' ادرک' لہسن اور طنجہ کے پاس کے پہاڑی شہر شیوان سے آیا ہوا زیتون کا تازہ تیل۔ لیکن یہ سب کچھ میں کس تناسب سے استعمال کرتی ہوں یہ میں ہرگز نہیں بتاؤں گی۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ اس ''قرب'' کی تیاری میں بے پناہ وقت اور روپے خرچ کرنے سے میرا کیا مفہوم ہے۔

میں کسی قسم کی شکایت نہیں کر رہی کیونکہ اس کے نتائج شاندار ہوتے ہیں۔ تاہم یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے کہ قرب کس طرح تیار کی جاتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اہم اس کی پیشکش کا طریقہ ہے اور وہ اس کی لذت اور لطف میں اضافہ کرتا ہے۔ قرب کی دعوت کھلی چھت پر ہونی چاہیے اور وہ بھی اس وقت جب چاند پورا ہو اور اس کی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہو۔ میں نے جانے کتنے مشکل شہوانی نسخوں والے کھانے تیار کیے۔ کئی دن تک سمندر کی لہروں میں تیرتی رہی یا ساحل پر صرف آرام کرتی رہی لیکن میرے ذہن پر یورپی حرم کا معمہ چھایا رہا۔

میں جب بھی پیچیدہ اور الجھے سوالات کو سلجھاتے ہوئے پریشان ہو جاتی ہوں تو اپنی دادی یاسمینہ کا سا رویہ اختیار کرتی ہوں۔ دادی یاسمینہ کا کہنا تھا کہ ''جو الجھن بھی ہے اسے مکمل طور پر بھول جاؤ' اپنی زندگی کو الجھنوں کا شکار مت کرو۔ ہم عورتوں کی زندگی کا راستہ پہلے ہی الجھا ہوا ہے۔ اپنے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ اور معاملات کو سہل سے سہل تر کرنے کی کوشش کرو۔'' میرے ذہن میں جب یہ بات آئی تو میں نے اس کتاب کو ختم کرنے کا ارادہ کچھ دنوں کے لیے مؤخر کر دیا۔ میں نے لکھنا بند کر دیا اور شہر میں چاندی کے زیورات کی اپنی پسندیدہ دکان مبارک کے چکر لگانے لگی۔ میں نے کوشش کی کہ کچھ موتی خریدوں اور عنبر کا ایک ہار بنوانے میں مصروف ہو گئی۔ رباط کی بے ہنگم ٹریفک کے باوجود تمارا کے ساحل پر غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کے لیے

جانے لگی۔ جی ہاں، میں نے عشق، جنس اور خوف کے
بارے میں فلسفیانہ خیالات کو جھٹکتے ہوئے بحراوقیانوس کے ساحل سے آفتاب کے ڈوبنے کے
شاندار مناظر پر ذہن کو مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ میں اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کے لیے اتنی
بے قرار تھی کہ میں نے مردوں کے تخیلات اور حرم کے بارے میں گفتگو کرنی ترک کر دی۔

کئی برس گزر گئے اور پھر ایک روز جب میں بیرون ملک ایک شہر میں تھی، صبح سویرے
میری آنکھ کھلی اور تب مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس پہننے کے لیے مناسب کپڑے تو ہیں ہی
نہیں۔ یہ وہ بات ہے جو گھر سے دور اکثر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے۔ میں نیویارک میں تھی، گرمی
کے دن تھے اور میرا لباس مجھے غیر آرام دہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے نیا لباس خریدنے کے لیے
سیدھے ایک امریکی ڈپارٹمنٹ اسٹور کا رخ کیا۔ اور وہاں صوفی داستانوں کی طرح میرے ساتھ
ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا۔ ذہن میں بجلی کی طرح کوندا چمکا اور ایک پرانی مشکل آسان کر گیا۔
مغربی حرم کی پہیلی کے بارے میں میرے کئی سوالات کے جواب مجھے مل گئے۔

(13)

چھ نمبر کا لباس: مغربی عورتوں کے حرم

میں ایک امریکی ڈپارٹمنٹ اسٹور میں اپنے لیے ایک سوتی لباس خریدنے کی ناکام کوشش کررہی تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے کولہے بہت بھاری ہیں اور 6 نمبر کا لباس میں نہیں پہن سکوں گی۔ اس پریشان کن تجربے سے مجھے معلوم ہوا کہ مغرب میں حسن کا تصور کسی عورت کی اسی طرح توہین اور تذلیل کرسکتا ہے جس طرح ایران، افغانستان اور سعودی عرب جیسے انتہا پسند ملکوں کی پولیس کی طرف سے عورتوں کو حجاب پہننے پر مجبور کرنا۔ جی ہاں، اسی روز اس تجربے نے مغربی حرم کے تصورات اور تابعدار حسن کی پہیلی کے بنیادی راز مجھ پر آشکار کیے۔ اس امریکن اسٹور میں دلربا سیلز لیڈی نے میری طرف دیکھا اور اپنی جگہ سے جنبش کیے بغیر کہہ دیا کہ اس کے پاس میرے سائز کا کوئی لباس موجود نہیں ہے۔ میں نے کہا ''یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے اسٹور میں میرے سائز کا کوئی لباس موجود نہ ہو۔ تم یقیناً مذاق کررہی ہو۔'' مجھے شک ہورہا تھا کہ یہ عورت شاید بہت تھکی ہوئی ہے اور اسی لیے اپنی جگہ سے ہلنے اور میری مدد کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔ یہ بات میں سمجھ سکتی تھی لیکن اسی لمحے اس عورت نے ایک ایسا جملہ کہا جو کسی امام کے فتوے سے کم نہ تھا۔ اس نے کہا ''تم بہت بھاری ہو۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
دیکھا اور پوچھا ''میں کس کی نسبت بھاری ہوں؟'' میں سمجھ گئی تھی کہ اس وقت مجھے ایک تہذیبی فرق کا سامنا ہے۔

''تم سائز 6 کی نسبت زیادہ بھاری بھرکم ہو'' اس نے ٹر سے مجھے جواب دیا۔

اس کی آواز میں وہی کاٹ اور دھار تھی جو مذہبی فتویٰ عائد کرنے والوں کی آواز میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میرے چہرے کی حیرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کہا ''ہمارے یہاں 4 اور 6 نمبر کے لباس کا رواج ہے۔ تم جیسی بھاری بھرکم جثّہ والی کیلئے خصوصی اسٹور ہیں جہاں سے تم لباس خرید سکتی ہو۔''

یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ میں نے اپنے جثّہ کے بارے میں اتنی فضول بات سنی ہو۔ مراکش کی گلیوں میں اپنے بھاری بھرکم کولہوں کے بارے میں ہمیشہ ستائشی جملے سنے تھے اور کئی دہائیوں سے مجھے یقین تھا کہ پوری دنیا ان جملوں اور فقروں پر اعتبار رکھتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بڑھتی عمر کے ساتھ شہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے اس طرح کے ستائشی فقروں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی ہے اور اب تو کبھی کبھی بازاروں میں چلتے پھرتے اپنے اردگرد کی خاموشی میرے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتی ہے۔ لیکن چونکہ میرا چہرہ کبھی بھی ہمارے یہاں کے حسن کے معیار پر پورا نہیں اترا اور اکثر مجھ پر اپنی لمبی گردن کی وجہ سے ''زرافہ'' کا جملہ کسا جاتا ہے جس کی میں تردید کرتی ہوں۔ یہی سبب ہے کہ میں نے بہت زمانے سے اپنے بارے میں لوگوں کی رائے کو کبھی اہمیت نہیں دی اور اپنی صلاحیتوں پر میرا اعتبار رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب ایک طالبہ کی حیثیت سے میں رباط گئی تو میری یہی خود اعتمادی اور خود انحصاری میرے کام آئی اور اپنے اردگرد کی حسین لڑکیوں کے درمیان رہ کر رشک میں مبتلا نہ ہونے کے رویے نے مجھے دوسروں کے لیے پرکشش بنا دیا۔ میرے مرد دوستوں کو اس بات پر بڑی مشکل سے یقین آتا تھا کہ میری جسمانی کشش یا حسن کے بارے میں ان کی رائے میرے لیے رائی برابر حیثیت نہیں رکھتی۔ ان میں سے ایک

کے فقرے پر پلٹ کر میں نے اس سے کہا تھا کہ ''میری
جان، مجھے زندہ رہنے کے لیے نان، زیتون اور سارڈین مچھلی کی ضرورت ہے۔ میری گردن اگر دوسری لڑکیوں کی نسبت لمبی ہے تو یہ تمہارا مسئلہ ہوگا میرے لیے یہ بات اہمیت نہیں رکھتی''۔

ہمارے شہر میں جہاں تک حسن اور ستائشی جملوں کا تعلق ہے، نہ کوئی بات حتمی ہے اور نہ کسی فقرے یا جملے کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے۔ یہاں ہر بات معرضِ بحث میں ہی رہتی ہے۔ لیکن امریکی ڈپارٹمنٹ اسٹور میں صورتحال مختلف تھی۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ نیو یارک کے اس ماحول نے میری خود اعتمادی کو قدرے متزلزل کر دیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنے شہر میں میری خود اعتمادی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ مراکش کی گلیوں میں پھرتے ہوئے یا یونیورسٹی کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے میں اس الجھن میں گرفتار نہیں ہوتی کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جب میں کوئی ستائشی جملہ سنتی ہوں تو میری انا کو تسکین ہوتی ہے جیسے کوئی پھولی ہوئی کچوری۔ لیکن عموماً میں دوسروں سے اس نوعیت کے جملوں کی توقع نہیں کرتی۔ کچھ صبحیں ایسی ہوتی ہیں جب اپنا آپ بہت برا لگتا ہے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب میں بیمار ہوں یا بہت تھکی ہوئی ہوں لیکن کچھ دن ایسے بھی ہوتے ہیں جب مجھے اپنے اردگرد کی ہر چیز خوبصورت اور خوشگوار محسوس ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس روز چمکدار دھوپ کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ یا میں نے کوئی بہت اچھی تحریر لکھی ہوتی ہے۔ لیکن اس روز نیو یارک کے ڈپارٹمنٹ اسٹور میں جو پرسکون تھا اور جہاں میں ایک بھرے ہوئے بٹوے والی خریدار کے طور پر فتح مندی کے احساس کے ساتھ داخل ہوئی تھی، وہاں مجھے یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ مجھ پر ذاتی حملہ کیا گیا ہے۔ میرے کولہے جو آج تک ایک پر آسائش اور بھری پری زندگی کی علامت تھے انہیں اچانک جسمانی نقص کے طور پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

اپنی خود اعتمادی کو بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اور متعینہ اصولوں کے بارے میں

سوال کرتے ہوئے میں نے اس سیلز لیڈی سے پوچھا

''اور لباس کے بارے میں یہ متعینہ اصول کون طے کرتا ہے؟'' مجھے اپنا بچپن اچھی طرح یاد ہے اسی لیے میں دوسروں کو اس بات کی چھوٹ نہیں دیتی کہ وہ میرے بارے میں فیصلے صادر کریں یا حکم لگائیں۔ فیض کی قدیم روایات کے مطابق گول چہرے اور گداز بدن لڑکیوں کی قدر و قیمت بہت تھی۔ اسی لیے مجھ سے یہ بات بار بار کہی جاتی تھی کہ میں بہت لمبی اور بہت دبلی ہوں اور میرے رخساروں کی ہڈیاں بہت ابھری ہوئی ہیں اور آنکھیں بہت ترچھی۔ میری اماں آہ بھرتے ہوئے اکثر کہتی تھیں کہ مجھے کبھی کوئی شوہر نہیں ملے گا۔ اور یہ مشورہ دیتی رہتی تھیں کہ مجھے تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دینی چاہیے اور زیادہ سے زیادہ چیزیں سیکھ لینی چاہئیں تاکہ مجھے روزی روٹی کمانے کی پریشانی نہ ہو۔ مجھے داستان سرائی سے کشیدہ کاری تک ہر ہنر سیکھنے کی تلقین کی جاتی ۔کبھی کبھی میں پلٹ کر جواب دیتی کہ ''اماں میں جیسی بھی ہوں مجھے اللہ نے بنایا ہے تو پھر اللہ اس قدر غلطی پر کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ بیچاری چپ ہونے میں عافیت سمجھتیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ مجھے جھٹلائیں گی تو بات اللہ پر حملے تک جا پہنچے گی اپنی ہونق صورت کو خدائی تحفہ ثابت کرنے کی حکمت عملی نے مجھے نہ صرف اپنے دم گھونٹ دینے والے شہر میں زندگی کا حوصلہ دیا بلکہ آہستہ آہستہ خود میں بھی اس خدائی تحفے والی کہانی پر اعتبار کرنے لگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرے اندر بڑی حد تک خود اعتمادی آ گئی۔ میں بڑی حد تک اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ جلد ہی مجھے اس بات کا احساس ہوگیا کہ خود اعتمادی چاندی کا کنگن نہیں ہے جو برسوں بعد بھی جوں کا توں رہتا ہے۔ یہ تو ننھی سی نازک روشنی ہے جو کبھی ہوتی ہے کبھی کھو جاتی ہے۔ اسے ہر لمحہ توانائی پہنچانے اور زندہ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس روز میں نے سیلز لیڈی کو چھیڑنے کی خاطر پوچھا کہ ''کون کہتا ہے کہ ہر عورت کو 6 نمبر کا لباس پہننا چاہیے؟'' میں نے جان بوجھ کر 4 نمبر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نمبر کا لباس میری بارہ سالہ بھانجی کو ٹھیک آتا ہے جو کہ دبلی پتلی ہے۔

میرے اس جملے پر سیلز لیڈی نے مجھے قدرے
تشویش بھری نگاہوں سے دیکھا ''مائی ڈیئر یہ ہر فیشن ہاؤس کا مروجہ سائز ہے۔ تم اسے فیشن میگزین، ٹیلی وژن اور اشتہاروں میں دیکھوگی۔ اس سے تم بچ کر نہیں نکل سکتیں۔'' پھر اس نے روانی سے مشہور اور مقبول فیشن ڈیزائنرز کے نام ایک ہی سانس میں گنوا دیے۔ ''کیلون کیلن، رالف لورن، جیانی ورساسے، گیور جیوار مانی، ماریو ویلینٹو، سلواٹور فیرا گامو، کرسچین ڈوئر، یے وی سینٹ لارین، کرسچین لیکرائے، جین پال گالیئر، تمام بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹور یہی سائز رکھتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر کہنے لگی ''اگر وہ 14 یا 16 سائز کا لباس فروخت کرنے لگیں جس کی تمہیں ضرورت ہے تو یہ سمجھ لو کہ وہ دیوالیہ ہو جائیں گے۔''

وہ ایک منٹ تک خاموش رہی پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا جیسے مجھے سمجھنا چاہ رہی ہو۔ ''ویسے تم دنیا کے کس حصے سے آئی ہو؟ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی، واقعی مجھے افسوس ہے۔'' اس نے کہا اور اس کے چہرے کے تاثرات بھی اس تاسف کا اظہار کر رہے تھے۔ اچانک وہ میرے بارے میں جاننا چاہنے لگی اور اس نے ایک دوسری خریدار سے سرد مہری برتتے ہوئے کہا ''میں مصروف ہوں، پلیز کسی دوسری سیلز لیڈی سے پوچھ لو'' اب میں نے اسے غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی میری طرح پچپن اٹھاون کے لگ بھگ تھی لیکن اس کا بدن کسی نوخیز لڑکی جیسا تھا۔ گھٹنوں تک لمبا اس کا نیوی بلیو شنیل کے لباس میں کالر سفید ریشم کا تھا جو بیسویں صدی کی ابتداء میں اشرافیہ کے کیتھولک گرلز اسکول یونیفارم کی یاد دلاتا تھا۔ کمر پر موتیوں جڑی بیلٹ تھی جو اس کی چھلاسی کمر کو نمایاں کر رہی تھی، نہایت نفاست سے ترشے ہوئے اس کے چھوٹے بال اور مہارت سے کیا ہوا میک اپ، پہلی نظر میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ 28-30 کی ہے، مجھ سے آدھی عمر کی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں ایک ایسے ملک سے آئی ہوں جہاں عورتوں کے لباس کا کوئی سائز نہیں ہوتا۔ میں اپنی پسند کا کپڑا خریدتی ہوں اور پڑوس میں رہنے والی کوئی درزن یا کوئی

ماہر درزی میرے لیے ریشمی یا چمڑے کا لباس تیار کر دیتا
ہے۔ میں جب بھی ان کے پاس جاتی ہوں، وہ ہر مرتبہ میرا ناپ لیتے ہیں۔ میری درزن یا میں، ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا کہ میری نئی اسکرٹ کا سائز کیا ہے۔ اسکرٹ جب سل رہی ہوتی ہے تب ہم دونوں کو اس کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ اگر میں اپنا ٹیکس وقت پر ادا کرتی رہوں تو مراکش میں کسی کو میرے لباس کے ناپ کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہوتی اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت بھی میں نہیں بتا سکتی کہ میری اسکرٹ کا
سائز کیا ہے۔''

اس سیلز لیڈی نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کہنے لگی کہ ''تمہیں اپنے ملک کے بارے میں اشتہار دینا چاہیے کہ وہ کام کرنے والی عورتوں کیلئے ایک جنت ہے۔ یعنی تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہیں ہر وقت اپنے وزن کی فکر نہیں ہوتی؟''۔ اس نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ تو اس کا لہجہ اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ میری بات کا اعتبار نہیں کر رہی اور پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ دھیمی آواز میں یوں گویا ہوئی جیسے خود سے بات کر رہی ہو۔ ''بہت سی عورتیں جو فیشن سے متعلق شعبوں میں کام کر رہی ہیں اور بڑی بڑی تنخواہیں لے رہی ہیں، وہ اگر سختی سے ڈائٹنگ نہ کریں اور اپنے وزن کا خیال نہ رکھیں تو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔''

اس کے ان سادہ الفاظ میں جو دھمکی پوشیدہ تھی وہ اتنی ظالمانہ تھی کہ میں پہلی بار اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید مسلم حجاب سے کہیں زیادہ ''سائز 6'' عورتوں پر تباہ کن پابندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اس سے جلدی سے رخصت لی کیونکہ میں اس کا اور زیادہ وقت نہیں لینا چاہتی تھی، نہ مجھے اس کی خواہش تھی کہ وہ اس ناخوشگوار اور خفیہ گفتگو میں حصہ لے اور بڑھتی ہوئی عمر اور گھٹتی ہوئی تنخواہ کے دلخراش معاملے پر روشنی ڈالے۔ نگرانی کرنے والے کیمرے کی آنکھ شاید ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

میں جب وہاں سے نکلی تو یہ بات جان چکی تھی کہ آخر کار میں نے مغربی حرم کی پہیلی بوجھ لی

ہے۔ مسلمان مرد اپنی فوقیت کو برقرار رکھنے کے لیے
عورتوں پر برسر عام آنے پر پابندی عائد کرتا ہے جبکہ مغربی مرد وقت اور روشنی کو اپنی تحویل میں رکھتا ہے۔ وہ یہ حکم جاری کرتا ہے کہ حسین نظر آنے کے لیے لازم ہے کہ ایک عورت 14 برس کی دکھائی دے۔ اگر وہ ایسا لباس پہنتی ہے جس
میں وہ 50 یا خدانخواستہ 60 کی نظر آئے تو پھر وہ برادری باہر ہے۔ یہ مغربی مرد تمام روشنیاں، بچی نظر آنے والی عورت پر مرتکز رکھتا ہے اور اسے مثالی حسن کا نمونہ قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی مرد ایمانول کانٹ کے انیسویں صدی کے نظریات کو لاگو کرتے ہیں یعنی حسین نظر آنے کے لیے عورتوں کو بچکانہ انداز اختیار کرنے چاہئیں اور انہیں خالی الذہن ہونا چاہیے۔ اگر کوئی عورت پختہ کار اور خود اعتماد نظر آتی ہے یا اپنے کولہوں کو بھاری ہونے کی اجازت دیتی ہے تو اس پر بدصورت ہونے کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح پر مغربی حرم نوخیز نوجوان حسن اور پختہ کار بدصورتی کے درمیان دیوار اٹھا دیتا ہے۔

میرے خیال میں یہ مغربی رویے مسلمانوں کی نسبت کہیں خطرناک اور عیارانہ ہیں۔ کیونکہ وہ عورتوں کے خلاف وقت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وقت اس طور نظر نہیں آتا اور مکان یا جگہ کی نسبت کہیں سیال ہے۔ مغربی مرد شبیہوں اور مرتکز روشنیوں سے نسائی حسن کو ایک مثالی نوخیزی میں منجمد کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ بڑھتی ہوئی عمر کو جو کہ برسوں کے گزرنے کا ایک فطری عمل ہے اسے کم حیثیت ہونے کا ایک شرمناک عمل سمجھیں۔ سیلز لیڈی کو غلط ثابت کرنے کے لیے میں اسٹور میں اسکرٹس کی قطاروں کے درمیان سے بہ آواز بلند یہ کہتی ہوئی گزری۔ ''یہ میں ہوں جو ڈائینوسار بنا دی گئی ہوں'' لیکن میری تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ وقت سے متعین کیا جانے والا یہ حجاب آیت اللہ حضرات کے مکان کے حوالے سے عائد کیے جانے والے حجاب سے کہیں زیادہ دیوانگی پر مشتمل ہے۔

مغربی حرم میں جو تشدد روا رکھا جاتا ہے وہ مشرقی حرم کی نسبت بڑی حد تک پوشیدہ رہتا

ہے۔ کیونکہ وہاں بڑھتی ہوئی عمر کو براہ راست نشانہ نہیں
بنایا جاتا بلکہ اسے جمالیاتی حسن کے

پردے میں چھپا دیا جاتا ہے۔ جی ہاں۔ اس اسٹور میں اچانک مجھے اپنی بدصورتی کا اور ناکارہ ہونے کا احساس ہوا۔ اگر آپ کے کولہے بھاری تھے تو آپ وہاں موجود ہی نہیں تھیں۔ آپ غیر موجودگی کے حاشیوں کی طرف جارہی تھیں۔ مغربی مرد نے نابالغ اور ناپختہ عورتوں پر روشنی مرتکز کر کے' عمر رسیدہ اور پختہ کار عورت کو بدصورتی کے کفن میں لپیٹ دیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے جھرجھری سے آ گئی۔ یہ تصور آنکھوں سے اوجھل عورت کو حرم کی جلد پر نقش کر دیتا ہے۔ چین میں عورتوں کے پیروں میں بچپن میں دھات کی جوتیاں پہنا دینے کا عمل بھی یہی تھا۔ مرد صرف ان ہی عورتوں کو حسین گردانتے تھے جن کے پیر بچیوں کی طرح چھوٹے ہوتے تھے۔ چینی مرد اپنی عورتوں کو اس بات پر مجبور نہیں کرتے تھے کہ وہ اپنے پیر معمول کے مطابق بڑھنے نہ دیں۔ وہ تو بس یہ کرتے تھے کہ نسائی حسن کا معیار متعین کر دیتے تھے۔ جاگیردارانہ نظام کے تحت زندگی گزارنے والی چینی عورتیں اپنی آزادانہ نقل وحرکت کو رضاکارانہ طور سے قربان کر دیتی تھیں اور اس بات کو ثابت کرتی تھیں کہ ان کی زندگی کا اصل مقصد مردوں کو خوش کرنا ہے۔ اسی طرح مغربی دنیا میں مجھ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ اگر مجھے سائز 6 کی ایسی اسکرٹ چاہیے جو خوبصورت اور نازک عورتوں کے لیے تیار کی گئی ہے تو پھر مجھے اپنے کولہوں کو کم کرنا ہوگا۔ ہم مسلمان عورتوں کو صرف رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن بے چاری مغربی عورت کو سال کے بارہ مہینے فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنے آس پاس امریکی عورتوں کو چلتے پھرتے اور خریداری کرتے ہوئے دیکھتی رہی اور زیر لب ''خوفناک۔ دہشت ناک'' بڑبڑاتی رہی۔ وہ تمام عورتیں جو میری عمر کی تھیں۔ وہ نابالغ اور نوخیز لڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

مصنفہ نادمی وولف کا کہنا ہے کہ 1990ء کی دہائی میں امریکی ماڈل گرلز کے مثالی وزن میں تیزی سے کمی آئی۔ ''ایک نسل پہلے اوسط درجے کی ایک ماڈل گرل کا وزن اوسط

درجے کی امریکی عورت سے 8 فیصد کم ہوتا تھا۔ لیکن
آج اس کا وزن 23 فیصد کم ہوتا ہے۔ مس امریکا بننے والیوں کا وزن تیزی سے کم ہوا۔ جبکہ ''پلے بوائے'' میں مرد ماڈلز کا وزن 1970ء کی دہائی میں قومی اوسط وزن میں 11 فیصد کی نسبت کم ہوا اور گزشتہ 8 برس میں یہ 17 فیصد کم ہو چکا ہے۔''(1)۔ وولف کا کہنا ہے کہ یہ گھٹتا ہوا مثالی وزن کا شوق، بھوک کم لگنے اور صحت کے کئی مسائل پیدا کرنے کا سبب بنا ہے۔ ''کھانے پینے سے بیزاری کا یہ رجحان تیزی سے بڑھا اور اعصابی افسردگی نے عورتوں سے غذا اور وزن کو چھیننا شروع کر دیا۔ اور انہیں اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔''(2)

مغربی حرم کا راز آخر کار مجھ پر آشکار ہوا۔ نوجوانی کو حسن قرار دینا اور پختہ کاری کو رد اور مطعون کرنا وہ ہتھیار ہیں جو مغربی عورت کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے مشرق میں عورت کی آزادانہ نقل وحرکت پر پابندیوں کو ایک ہتھیار کے طور استعمال کیا جاتا ہے۔ دونوں تہذیبوں میں مقصد یکساں ہے اور وہ یہ کہ عورتوں کو غیر مطلوب ہونے کا اور نااہل اور بدصورت ہونے کا احساس دلایا جائے۔

مغربی مرد یہ حکم صادر کرتا ہے کہ عورتیں کیا پہنیں گی اور کیسی نظر آئیں گی۔ ساری کی ساری فیشن کی صنعت اس کے دائرہ اختیار میں ہے خواہ یہ سامان آرائش وزیبائش ہو یا زیر جاموں کی صنعت۔ مجھ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ صرف مغرب میں ہی ایسا ہے کہ عورتوں کا فیشن مردوں کی تجارت ہے۔ مراکش جیسی جگہوں پر جہاں آپ اپنے لباس کا نمونہ خود تیار کرتی ہیں اور دوسری عورتوں یا درزیوں سے اس پر صلاح مشورہ کرتی ہیں۔ وہاں عورتوں کا فیشن آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے لیکن مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ ناؤمی وولف نے اپنی کتاب The Beauty Myth میں لکھا ہے کہ مردوں نے فیشن سے وابستہ متعلقات کے بارے میں غیر معمولی حد تک جوش وجذبے کو اکسایا ہے اور اسے ایک صنعت بنا دیا ہے۔ ''نہایت طاقتور صنعتیں وجود میں آئی ہیں۔ جن میں 33 ارب ڈالر سالانہ ڈائٹ انڈسٹری، 20 ارب ڈالر سالانہ کاسمیٹک

انڈسٹری، 300 ملین ڈالر سالانہ کی کاسمیٹک سرجری
انڈسٹری اور 7 ارب ڈالر سالانہ کی پورنوگرافی انڈسٹری بالکل سامنے کی صنعتیں ہیں۔ یہ غیر شعوری فکروں اور پریشانیوں سے کمائے جانے والے سرمائے سے وجود میں آئی ہیں۔ انہوں نے عوامی کلچر پر اپنے اتنے اثرات مرتب کیے ہیں کہ وہ اس خیالی واہمے کو مستحکم کرتی ہیں کہ اقتصادی طور پر ترقی ہو رہی ہے۔'' (3)

میں سوچتی رہی کہ یہ نظام کس طرح کام کرتا ہے اور عورتیں اسے کیوں تسلیم کرتی ہیں؟

اس کی ممکنہ بہترین توجیہات میں مجھے فرانسیسی ماہر عمرانیات پیری بوردیو کی توجیہ سب سے زیادہ پسند آئی۔ اپنی تازہ ترین کتاب La Domination Masculine میں وہ ''استعاراتی تشدد کی بات کرتا ہے۔ ''استعاراتی تشدد وہ طاقت ہے جو براہ راست بدن پر استعمال کی جاتی ہے اور جیسے جادوئی طور پر بہ ظاہر اپنے نشان نہیں چھوڑتی۔ یہ جادو اس لیے اپنا کام دکھاتا ہے کہ یہ بدن کی آخری تہوں پر ثبت کیے جانے والے اشاروں کو حرکت میں لے آتا ہے۔'' (4)۔ بوردیو کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ تاثر ہوا کہ میں آخر کار مغربی مرد کی نفسیات کو بہتر طور پر سمجھنے لگی ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ کاسمیٹک اور فیشن انڈسٹری تو ایک بہت اونچے برف کے پہاڑ کی چوٹی کی حیثیت رکھتی ہے اور عورتیں ان کے احکامات پر عمل کرتی ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ گہرائی میں کچھ ہو رہا ہے۔ ورنہ عورتیں اس قدر بے اختیاری سے اپنی قدر و قیمت کیوں کم کرتیں۔ بوردیو مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ عورتیں اپنے سے طویل القامت اور بڑی عمر کے مردوں کو ترجیح دینے کے چکر میں اپنی زندگی مشکل کیوں بنائیں؟ '' فرانسیسی عورتوں کی اکثریت ایسے شوہروں کی خواہش کرتی ہے جو عمر میں اس سے بڑے ہوں اور جثّے میں بھی اس سے بھاری بھرکم ہوں''۔(5) اس کا کہنا ہے کہ عورت کے بدن کی پراسرار گہرائیوں میں جو استعاراتی تشدد اور مرد کے سامنے سر جھکانے کا تصور نقش ہے صنفی مراتب کا جو حساب ہے اسی کے حوالے سے بڑی عمر اور بھاری بھرکم بدن ان کی ترجیح ٹھہرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کم رتبے پر فائز ہونے میں ہرج

نہیں محسوس کرتیں۔ اس بے اختیارانہ رویے کو بوردیو
جادوئی اور مسحور ہو جانے والا رویہ کہتا ہے''۔(6)

جیسے ہی یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ سرفگندگی کا یہ مسحور ہو جانے والا رویہ کس طرح ظہور پذیر ہوتا ہے، میں اس بات پر بہت خوش ہوئی کہ ابھی تک یہ ہنر قدامت پسند آیت اللہ حضرات کو نہیں معلوم ہوا ہے۔ اگر یہ بات انہیں معلوم ہو جائے تو وہ فوراً ان شائستہ طریقوں کو اختیار کر لیں گے کیونکہ یہ کہیں زیادہ پُر اثر ہیں۔ میری ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج کر دینے کا بہترین طریقہ مجھے میری غذا سے محروم کر دینا ہے۔

ناؤمی وولف اور پیری بوردیو دونوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''بدن کے اندر چھپے ہوئے'' یہ عیارانہ اشارے مغربی عورت میں طاقت اور اقتدار کے حصول کے لیے مسابقت کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ حالانکہ بہ ظاہر ان کے لیے تعلیم اور پیشہ ورانہ امکانات کے تمام دروازے مکمل طور سے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن صنف کے اعتبار سے کھیل کی شرائط اور قوانین بالکل مختلف ہیں۔ اقتدار اور طاقت کے حصول کے لیے عورتیں جب میدان میں اترتی ہیں تو ان کی بے پناہ صلاحیتیں ان کے ظاہری حسن اور آرائش پر اس قدر زیادہ صرف ہو جاتی ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں اور مردوں کو کھیلنے کے لیے ایک جیسا ہموار میدان ملتا ہے۔ وولف کا کہنا ہے کہ ''عورتوں کے نازک اندام نظر آنے پر ''خبط'' کی حد تک اتنا زیادہ اصرار اس لیے نہیں ہے کہ مرد انہیں حسین دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ یہ عورتوں کو تابعدار رکھنے کے لیے ہے۔ عورتوں کی تاریخ میں ''ڈائٹنگ'' سب سے زیادہ خطرناک اور نیم غنودہ رکھنے والی سیاسی دوا پائی نہیں جاتی۔ ایک ایسی آبادی جو چپکے سے دیوانہ کر دی گئی ہو اسے قابو میں رکھنا بہت آسان ہوتا ہے۔''(7) وہ اس بات کو تحقیقات کے حوالے سے لکھتی ہے کہ ''وزن کے بارے میں بہت زیادہ سوچ بچار عورتوں کی عزت نفس کو برباد کر دیتا ہے اور ان کی اثر پذیری کی صلاحیتیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ اگر لمبے عرصے تک کیلوریز کی مقدار کم کی جائے تو اس کا نتیجہ ایسی شخصیت کی صورت میں سامنے آتا

ہے۔ جو غیر متحرک' پریشانی میں گرفتار اور نہایت جذباتی

ہوتی ہے۔'' (8) اس طرح بوردیو اس بات پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز کرتا ہے کہ حسن کا یہ تصور عورت کے بدن پر اپنے گہرے نقوش مرتب کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر عورتوں کو ان کی ظاہری شخصیت بار بار یاد دلائی جائے تو وہ جذباتی طور پر غیر متوازن ہو جاتی ہیں چونکہ اس طرح انہیں ایک نمائشی شے ہونے کا احساس ہوتا ہے۔'' عورتوں کو اگر ایک علامتی شے کے منصب پر فائز کر کے محدود کر دیا جائے اور ان کا مقصد یہ ہو کہ دوسرے انہیں دیکھیں اور ان کے بارے میں اپنے تصورات رکھیں' مردوں کی یہ بالادستی عورتوں کو جسمانی طور پر مستقلاً غیر محفوظ

ہونے کی کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے۔...... انہیں مسلسل اس تگ و دو میں رہنا پڑتا ہے کہ وہ خوش شکل اور دلربا نظر آئیں اور دسترس میں رہیں''۔ (9) ایک غیر فعال شے کے طور پر منجمد ہو جانا جس کا وجود ہی اپنے دیکھنے والے کا مرہون منت ہو' اس صورتحال نے مغرب کی تعلیم یافتہ جدید عورت کو حرم کی ایک کنیز بنا کر رکھ دیا ہے۔

میں جب پیرس سے کاسابلانکا جانے والی پرواز پر تھی اور آخر کار گھر کی طرف جا رہی تھی' میں زیرلب بار بار یہی دہراتی رہی کہ ''یا اللہ میں تیری شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے سائز 6 کے حرم کے عذابوں میں نہیں ڈالا...... یا اللہ میں اس قدر خوش ہوں کہ ہماری قدامت پرست مرد اشرافیہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر ہمارے رجعت پسند حجاب کی بجائے ہم عورتوں کو سائز 6 پہننے پر مجبور کرنے لگیں تو کیا ہوگا؟''

آپ ایک سیاسی مظاہرے میں کس طرح شریک ہو سکتی ہیں اور سڑکوں پر کس طرح یہ نعرے لگا سکتی ہیں کہ آپ کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اگر آپ کو پہننے کے لیے درست ناپ کا لباس ہی مہیا نہ ہو؟